آئینہ نما

۱۰

قرۃ العین

مہمان خصوصی ایس، آر، قدوائی
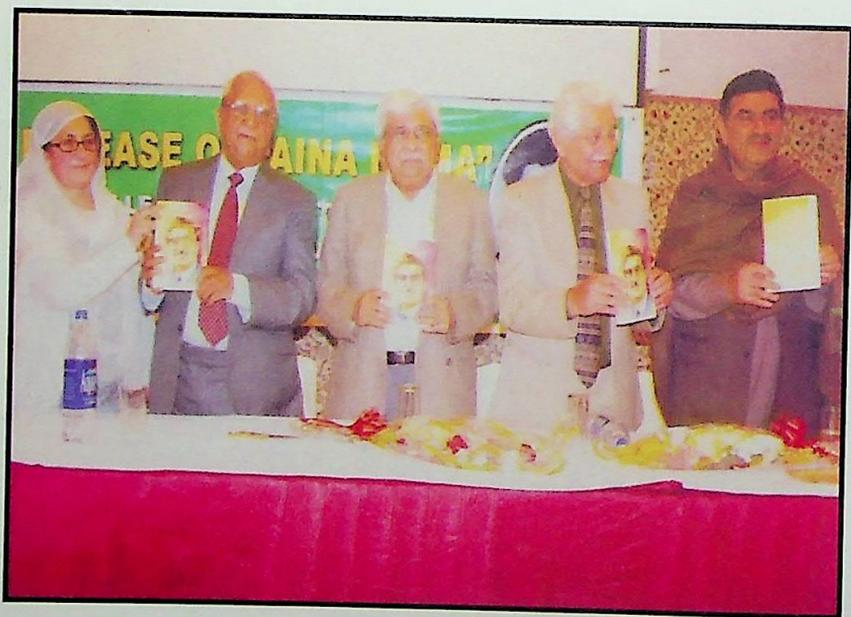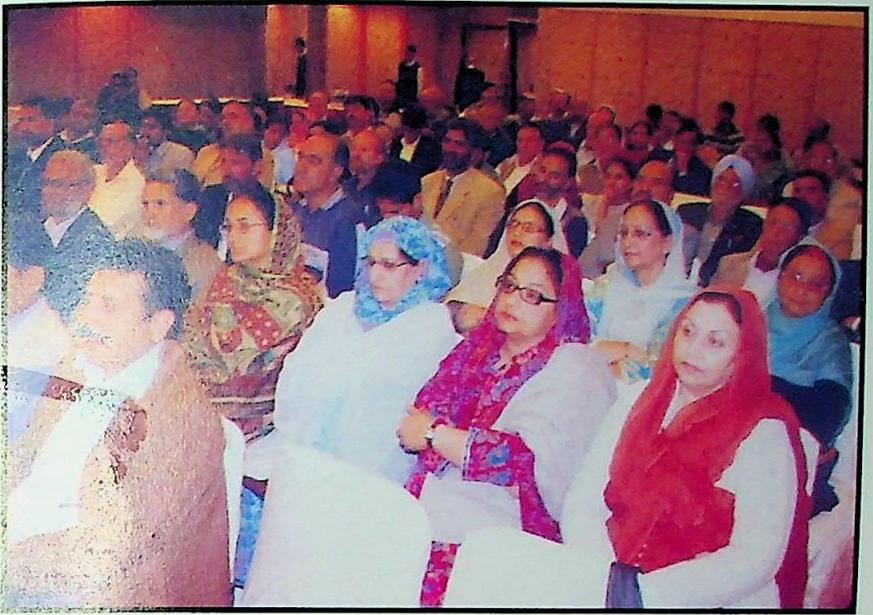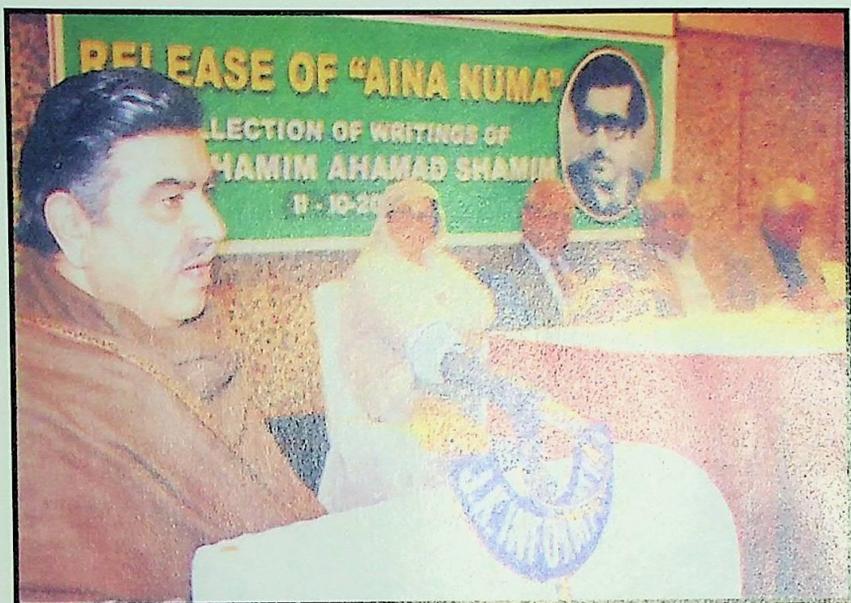
جسٹس بشیر کرمانی اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے
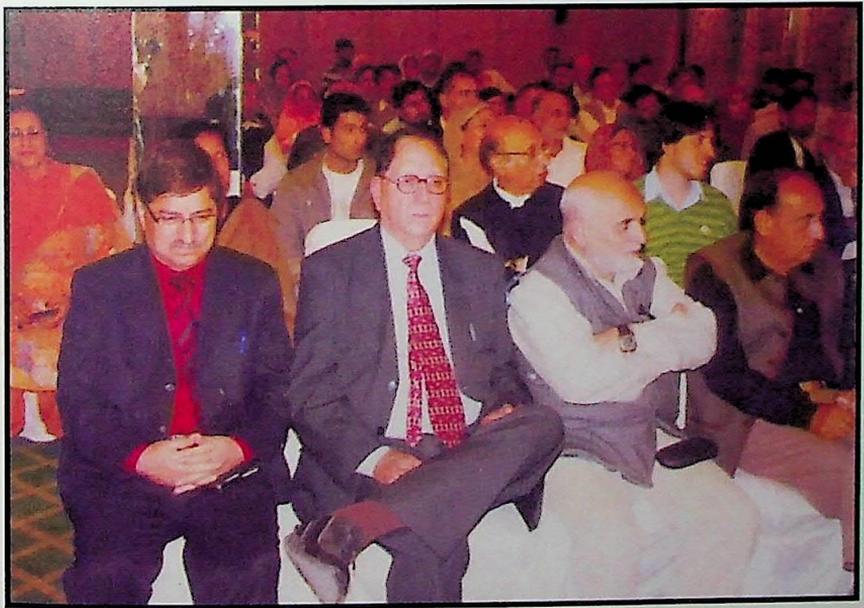
آئینہ نما

(۱۰)

مرتب

قرۃ العین

نام کتاب: آئینہ نما

مرتب/ ناشر: قرۃ العین

پتہ: باغات برزلہ، نزدیک بون اینڈ جوئنٹ
ہسپتال برزلہ سرینگر
فون: 2433795/9419015745

کمپیوٹر کمپوزر: سید محمد شفیع
فون: 9797101561

سرورق: جی احمد

سال اشاعت: ۲۰۱۲ء

قیمت: عام ایڈیشن =/300
لائبریری ایڈیشن =/400

طباعت: ایچ ایس آفسیٹ، نئی دہلی

تقسیم کار: انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایوینیو، نئی دہلی۔ ۲

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱/	اپنی بات	۹
۲/	آج کی بات	۱۲
	ایڈیٹر کی ڈائری	
۳/	شیخ صاحب کی وصیّت	۱۳
۴/	وزیر اعظم سے ملاقات	۱۴
۵/	حاجی مستان کی دستک	۱۶
۶/	ہمیں احساس ہے!	۲۰
۷/	۲۲ ستمبر سے قبل اور بعد	۲۲
۸/	یتیم ٹرسٹ کی خدمات	۲۶
۹/	امیر ترین شخص	۲۸
۱۰/	لون صاحب کا ''جرم''	۲۹

۱۱/	ذاتی تعلقات اور سیاسی حالات	۳۱
۱۲/	مجاہدین آزادی کی نمائش	۳۳
۱۳/	ویدراہی کی ''دراڑ''	۳۵
۱۴/	جموں اور جن سنگھ	۳۸
۱۵/	۱۲...... جون ۱۹۷۵ء	۴۱
۱۶/	ہفت روزوں کی ''روزی''	۴۷
۱۷/	مہندر کول	۴۹
۱۸/	اس گھر کو آگ لگ گئی......	۵۱
۱۹/	اُردو ایڈیٹرس کانفرنس	۵۴
۲۰/	موڈاسا کی تباہ کاریاں	۵۸
۲۱/	سیٹھ گووند داس کو ''شردھانجلی''	۶۲
۲۲/	''سرینگر ٹائمز'' پر حملہ	۶۵
۲۳/	حکومت اور اپوزیشن	۶۶
۲۴/	دہلی اور سرینگر کے درمیان کا فاصلہ	۷۰
۲۵/	ڈاکٹر کرن سنگھ کا استعفیٰ	۷۶
۲۶/	رشید صاحب کا عروج وزوال	۷۸
۲۷/	علی گڈھ اور ہندوستانی مسلمان!	۸۱
۲۸/	نوجوان ڈاکٹر بدقسمت مریض	۸۳
۲۹/	مریض ڈاکٹر	۸۶

۳۰/	غیر متزلزل اعتقاد	۸۸
۳۱/	لاشوں کی تجارت	۹۰
۳۲/	ہفتہ واری صحافت	۹۲
۳۳/	مجھے میرے ناصحوں سے بچاؤ	۹۳
۳۴/	مثال اور کردار	۹۷
۳۵/	کس کی ہار کس کی جیت	۱۰۰
۳۶/	ہنگامی حالات کے ہنگامے	۱۰۲
۳۷/	گوبلز کے شاگرد	۱۰۴
۳۸/	دہلی کے شب وروز	۱۰۷
۳۹/	آئینہ کے گیارہ سال	۱۱۲
۴۰/	مُراعات اور حقوق کی کشمکش	۱۱۵
۴۱/	استعفیٰ اور انتخابات	۱۲۲
۴۲/	سید حسین بنام افتخار حسین	۱۲۴
۴۳/	پرکاش ویر شاستری بنام شمیم احمد شمیم	۱۲۶
۴۴/	شری فوطیدار کی سعی ناکام	۱۲۸
۴۵/	کرشنا مینن	۱۲۹
۴۶/	غلام نبی طوری	۱۳۱
۴۷/	ضمیر کی پارلیمنٹ	۱۳۵
۴۸/	ہم کیا نہیں کریں گے	۱۳۶

۱۱/	ذاتی تعلقات اور سیاسی حالات	۳۱
۱۲/	مجاہدین آزادی کی نمائش	۳۳
۱۳/	ویدراہی کی ''دراڑ''	۳۵
۱۴/	جموں اور جن سنگھ	۳۸
۱۵/	۱۲......جون ۱۹۷۵ء	۴۱
۱۶/	ہفت روزوں کی ''روزی''	۴۷
۱۷/	مہندر کول	۴۹
۱۸/	اس گھر کو آگ لگ گئی......	۵۱
۱۹/	اُردو ایڈیٹرس کانفرنس	۵۴
۲۰/	موڈاسا کی تباہ کاریاں	۵۸
۲۱/	سیٹھ گووند داس کو ''شردھانجلی''	۶۲
۲۲/	''سرینگر ٹائمز'' پر حملہ	۶۵
۲۳/	حکومت اور اپوزیشن	۶۶
۲۴/	دہلی اور سرینگر کے درمیان کا فاصلہ	۷۰
۲۵/	ڈاکٹر کرن سنگھ کا استعفیٰ	۷۶
۲۶/	رشید صاحب کا عروج وزوال	۷۸
۲۷/	علی گڈھ اور ہندوستانی مسلمان!	۸۱
۲۸/	نوجوان ڈاکٹر بدقسمت مریض	۸۳
۲۹/	مریض ڈاکٹر	۸۶

۳۰ر	غیر متزلزل اعتقاد	۸۸
۳۱ر	لاشوں کی تجارت	۹۰
۳۲ر	ہفتہ واری صحافت	۹۲
۳۳ر	مجھے میرے ناصحوں سے بچاؤ	۹۳
۳۴ر	مثال اور کردار	۹۷
۳۵ر	کس کی ہار کس کی جیت	۱۰۰
۳۶ر	ہنگامی حالات کے ہنگامے	۱۰۲
۳۷ر	گوبلز کے شاگرد	۱۰۴
۳۸ر	دہلی کے شب و روز	۱۰۷
۳۹ر	آئینہ کے گیارہ سال	۱۱۲
۴۰ر	مُراعات اور حقوق کی کشمکش	۱۱۵
۴۱ر	استعفیٰ اور انتخابات	۱۲۲
۴۲ر	سید حسین بنام افتخار حسین	۱۲۴
۴۳ر	پرکاش ویر شاستری بنام شمیم احمد شمیم	۱۲۶
۴۴ر	شری فوطیدار کی سعی ناکام	۱۲۸
۴۵ر	کرشنا مینن	۱۲۹
۴۶ر	غلام نبی طوری	۱۳۱
۴۷ر	ضمیر کی پارلیمنٹ	۱۳۵
۴۸ر	ہم کیا نہیں کریں گے	۱۳۶

۴۹/	گاندربل کا مردفقیر	۱۳۹
۵۰/	پروفیسر حاجنی	۱۴۱
۵۱/	شفیع قریشی	۱۴۲
۵۲/	نیشنل کانفرنس کی جیت	۱۴۳
۵۳/	عیداور سیاست	۱۴۵
۵۴/	دوہرے معیار	۱۴۷
۵۵/	مجاہدین آزادی کا نیلام	۱۴۹
۵۶/	رفیق صادق کا خط	۱۵۱
	باتیں ہماریاں	
۵۷/	پارلیمنٹ کا موجودہ اجلاس	۱۵۴
۵۸/	جواہر لال نہرو، مسز گاندھی اور اوم مہتہ	۱۵۹
۵۹/	صدر ہسپتال کی کہانی	۱۶۴
۶۰/	رنگوں کی بہار	۱۶۵
۶۱/	ترکمان گیٹ کا سانحہ	۱۶۶
۶۲/	ہماری سیاست......تب اور اب	۱۶۸
۶۳/	ملک سپلائی سکیم کی تلاش	۱۶۹
۶۴/	بادشاہ سے زیادہ وفادار	۱۶۹
۶۵/	یونس صاحب کی برہمی	۱۷۱
۶۶/	پیرزادہ صاحب کا گناہ	۱۷۳

۶۷/	قبرستان کی خاموشی	۱۷۶
۶۸/	لہو کا پھول	۱۷۷
۶۹/	''شعلے'' میں کیا ہے؟	۱۷۹
۷۰/	رجنی پٹیل	۱۸۰
۷۱/	لندن کی چند یادیں	۱۸۱
۷۲/	ونود کمار......انسان دوستی کی یادگار	۱۹۳
۷۳/	کنول کا پھول	۱۹۶
۷۴/	کرشن چندر......کچھ یادیں	۲۱۰
۷۵/	پریم ناتھ در......میرا یار	۲۲۵
۷۶/	چھوٹی چھوٹی باتیں	۲۳۶
۷۷/	پردہ پوشی کی اصل حقیقت	۲۴۳
۷۸/	مشتاق احمد کا گناہ	۲۴۹
۷۹/	اساتذہ کا جرم	۲۵۴
۸۰/	رسم اجراء	۲۵۷

”شمیم کی تحریر دیکھنے سے پہلے میں ان کی تقریر سن چکا تھا اور بڑے نازک وقت میں یہ تقریر سن چکا تھا۔ بمبئی میں اُردو کنونشن کے موقعے پر ہوم منسٹر شری چوان کی موجودگی میں جناب شمیم نے جو دھواں دھار تقریر فی البدیہ فرمائی تھی اور جس صاف گوئی سے اُردو کے سلسلے میں ہونے والی سیاسی دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا تھا اور جس تقریر کی چنگاری صرف حکومت ہند ہی پر نہیں۔ اس خاکسار پر بھی بکھر رہی تھیں۔ یہی وہ شعلہ بیانی تھی یا تقریر کا جادو تھا کہ کوئی گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا“۔

(کرشن چندر)

اپنی بات

حسب وعدہ ''آئینہ نما'' کا دسواں شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ ''آئینہ نما'' کا یہ شمارہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ ''آئینہ'' کی تمام تحریریں چونکہ شمیم صاحب کی اپنی تخلیق ہوا کرتی تھیں اس لئے ان کے لکھنے والوں کے قلمی نام بھی وہ خود ہی تجویز کرتے تھے۔ مثلاً اگر تیسرا صفحہ چراغ بیگ کیلئے مخصوص تھا تو دوسری نگارشات کو انہوں نے ایڈیٹر کی ڈائری اور 'باتیں ہماریاں' کا عنوان دیا۔ آج کے شمارے میں ان ہی عنوانات کے تحت نگارشات کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں اور بہت سے موضوعات کے علاوہ ملک میں ۱۹۷۵ء میں مسز گاندھی کی لاگو کی گئی ایمرجنسی کا مکمل احوال ہے۔

ایمرجنسی کے تحت ملک میں تحریر وتقریر پر زبردست سنسرشپ اور کڑی پابندیاں قائم تھیں۔ چاروں طرف خوف وہراس کی فضا تھی اور پورے ملک پر ایک جمود اور خوفناک سناٹا چھایا تھا۔ اخبارات میں وہی کچھ چھپتا جس کی حکومت اجازت دیتی۔ لیکن اس کے باوجود 'آئینہ' میں ایمرجنسی کے قواعد وضوابط کی حدود میں رہ کر بڑے لطیف انداز میں ملک کی سیاسی صورت حال،

سیاستدانوں، صحافیوں، وکیلوں، تاجروں اور دیگر اہم طبقوں کے ردِعمل، تاثرات، تبصرے اور آرا کی مکمل تفصیل ملتی ہے۔

ملک کے مشہور اور معروف ادیب کرشن چندر سے شمیم صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ ان کی موت پر ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شمیم صاحب نے کرشن چندر کی کشمیر سے بے پناہ محبت اور اردو سے والہانہ لگاؤ کا اپنے منفرد انداز میں ذکر کر کے ان کی شخصیت کے چھپے ہوئے گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

وادی کے مشہور معالج اور کشمیری زبان کے ڈرامہ و افسانہ نگار ڈاکٹر شنکر رینہ اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ افسانہ نگار پریم ناتھ دران کے قریبی دوستوں اور رفیقوں میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کی موت ان کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا۔ ان کی اچانک وفات پر ان کے تئیں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے آپ نے ان شخصیات کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈال کر ادب میں ان کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

'پردہ پوشی کی اصل حقیقت' کشمیر کی مخصوص پوزیشن کا پوسٹ مارٹم ہے اور بہت سی خوش فہمیوں کا ازالہ کرنے میں مددگار بھی۔

شمیم احمد شمیم کے خلاف ایک نہیں تین مراعات شکنی کی تحریکوں کا احوال ہے جس سے اس دور کے بعض نامور اور کہنہ مشق سیاستدانوں کی پارلیمانی اور آئینی قواعد و ضوابط سے بے خبری، ثابت ہوتی ہے۔

آج سے پورے ۳۲ ربرس پہلے یکم مئی کو شمیم احمد شمیم اس دنیائے فانی

سے چل بسے اور اپنے پیچھے اپنی تحریروں کی صورت میں کشمیر کی ادبی، سیاسی اور صحافتی زندگی کی ایک بھرپور تاریخ چھوڑ گئے۔ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر 'آئینہ' کو 'آئینہ نما' کا روپ دینے کا آغاز بڑی تاخیر سے ہوا۔ امید وبیم، خدشات اور وسوسوں کے درمیان میں نے اس سفر کی ابتداء کی۔ میرے لئے اس سفر کو اکیلے طے کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے اپنی دشواریوں، کوتاہیوں اور راہ میں حائل رکاوٹوں کا بخوبی احساس تھا لیکن ان کے ساتھ ہی مجھے شمیم صاحب کے رفیقوں، دوستوں اور مہربانوں کی ان کے تئیں بے پناہ محبت، عقیدت اور خلوص پر بھی بھروسہ تھا اور 'آئینہ نما' کی پہلی تقریب پر ان کی بھرپور شرکت اور دلچسپی کو دیکھکر میرے اس اعتماد اور یقین کو تقویت ملی کہ تمام مشکلات اور مسائل کے باوجود میں اس سفر کو بخوبی طے کروں گی۔ پروردگارِ عالم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری کوششیں، آپ کے تعاون اور خلوص سے بارآور ہوئیں اور آج میں دسواں شمارہ لے کر آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا۔ یہ جاننے کیلئے آپ کی رائے کی منتظر۔

فقط

قرۃ العین

آج کی بات

لور جہلم ہائیڈل پروجیکٹ پر کام تقریباً پندرہ برس سے جاری ہے۔ پروجیکٹ کو پروگرام کے مطابق صرف پانچ سال میں مکمل کیا جانا تھا...... آج تک اس کو شروع کرنے کے لئے کئی بار آزمائش کی گئی اور ہر بار کوئی نہ کوئی نقص سامنے آیا۔ چنانچہ اب کی بار جس خرابی کی نشاندہی ہوئی ہے۔ اسے ٹھیک کرنے میں ایک اندازے کے مطابق ایک برس کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ وزیر تعمیرات مسٹر زبو نے اگرچہ اس اندازے کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے تاہم اُنہوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ اسے کب شروع کیا جاسکے گا۔ کروڑوں روپے کی لاگت سے تیار کئے گئے اس پروجیکٹ میں اتنے نقایص کیوں ہیں۔ اس قسم کے منصوبے دنیا کے کسی بھی ملک میں اس طرح ٹھپ نہیں ہوتے ہیں۔ بہر حال جو بھی ہو حکومت کو چاہئے کہ وہ فوری طور پر اس سلسلے میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کرکے ذمہ دار لوگوں کو عبرت ناک سزائیں دِلوانے کی راہ ہموار کرے۔

۱۴اپریل ۱۹۷۷ء

شیخ صاحب کی وصیّت :-

یہ غالباً چار سال پہلے کی بات ہے کہ جناب شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری عوام کی بے عزتی، بے حسی اور بے عملی پر اپنی سخت مایوسی اور بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ وصیت کی تھی، کہ ان کی موت کے بعد ان کی لاش کو کشمیر میں دفن کرنے کی بجائے بحیرہ عرب کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ اپنی اس غیر معمولی وصیّت کا انہوں نے یہ جواز دیا تھا کہ انہیں ایسی زمین میں دفن ہونا گوارا نہیں کہ جہاں کے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی سچی تڑپ اور خود داری کا جذبہ ناپید ہو۔ شیخ صاحب نے اپنی وصیّت کو بڑے بڑے اجتماعات میں اس تسلسل اور تکرار سے بیان کیا کہ بہت سے لوگوں کے لئے شیخ صاحب کی یہ خواہش آج بھی ان کے فرمان کی حیثیت رکھتی ہے۔ پچھلے دو تین سال سے شیخ صاحب نے اس سلسلے میں مکمل خاموشی اختیار کی ہے اور اس دوران میں وہ دو سال کے لئے ریاست کے وزیراعلیٰ بھی رہے۔ وزیراعلیٰ بننے کے چند روز بعد اور وزیراعلیٰ کے منصب سے سبکدوش ہو کے

چند دن بعد کشمیری عوام نے جس محبت اور عقیدت سے ان کا استقبال کیا، اس کی روشنی میں اب بہت لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا شیخ صاحب کی نگاہوں میں کشمیری عوام آج بھی اتنے بے غیرت، بے حس اور بے عمل ہیں کہ وہ اپنی پرانی وصیّت پر قائم رہنا چاہیں گے؟ خدا شیخ صاحب کی عمر دراز کرے، اور ابھی سو برس تک ان کا سایہ ان کے بچوں پر قائم رہے۔ لیکن زندگی کا کیا بھروسہ؟ اس لئے شیخ صاحب کو اپنی چار سالہ وصیّت کے بارے میں یہ وضاحت ضرور کرنا چاہیئے کہ آیا وہ آج بھی اس پر قائم ہیں یا اسے منسوخ سمجھتے ہیں؟ یہ بات مجھے یاد ہے کہ شیخ صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ وصیّت کی تھی اور جب تک وہ اسے منسوخ نہ کریں، قانونی، اخلاقی اور مذہبی اعتبار سے اس پر عمل درآمد کرنا ضروری ہوگا۔ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ گذشتہ چار سال کے دوران بالعموم اور پچھلے تین چار ہفتوں کے دوران بالخصوص شیخ صاحب کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کہ یہ قوم اتنی بے غیرت، بے حس اور بے عمل نہیں جتنا وہ چار سال پہلے اسے سمجھتے تھے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی پُرانی وصیت کو منسوخ کر کے نئی وصیّت کر لیں۔ تاکہ کسی نازک مرحلے پر کوئی نازک جھگڑا پیدا نہ ہو جائے۔

وزیراعظم سے ملاقات:۔

پچھلے ہفتے دہلی میں اپنے قیام کے دوران میں نے بہت سے مرکزی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کیا اور انہیں اپنی بصیرت کے مطابق کشمیر کی موجودہ سیاسیات سے روشناس کیا۔ اس سلسلے میں وزیراعظم شری مرارجی ڈیسائی

سے میری ملاقات خاصی دلچسپ اور اہم تھی۔ پچھلی لوک سبھا میں مرار جی بھائی اور میں دونوں ہی حزب مخالف کے ممبر تھے۔ وہ پارلیمنٹ کی روزمرہ کاروائی میں تو حصہ نہیں لیتے تھے، لیکن ہر روز لوک سبھا میں آکر ایک پچھلی نشست پر بیٹھنا ان کا معمول تھا۔ ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے مرار جی بھائی پارلیمنٹ میں میرے رول سے اچھی طرح آشنا ہیں اور ایمرجنسی کے دوران میری حق گوئی و بیباکی سے متاثر بھی ہیں۔ اس لئے ان سے بے تکلف ہو کر گفتگو کرنے میں نہ مجھے کوئی دشواری محسوس ہوئی اور نہ انہیں کوئی تکلیف۔ آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں، میں نے انہیں مختصراً اپنے خیالات سے روشناس کیا اور ان کے ردعمل سے میں نے یہ اندازہ کیا، کہ کشمیر کی سیاست اور شخصیات کے بارے میں ان کی معلومات مجھ سے کہیں زیادہ ہیں۔ مرار جی بھائی نے کہا کہ کشمیر کے لوگ بہت بھلے اور معصوم ہیں اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اتنے اچھے لوگ شاید ہی کہیں اور ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کی ترقی کی طرف ابھی تک ٹھیک سے توجہ نہیں دی گئی ہے۔ مرار جی بھائی نے مجھے یقین دلایا کہ اب کی بار کشمیر میں اسمبلی کے جو انتخابات ہوں گے وہ صحیح معنوں میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ ہوں گے۔ مرار جی ڈیسائی کے بارے میں بہت سی اچھی اور بُری باتیں مشہور ہیں لیکن وزیراعظم بننے کے بعد میری ان کی دوسری ملاقات کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخص اپنے اصول اور اپنی بات پر سختی سے کاربند رہنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہے اس لئے ریاستی عوام کو اس بات پر یقین کر لینا چاہئے کہ

جون میں ہونے والے انتخابات ریاست کی تمیں سالہ تاریخ میں پہلے آزادانہ انتخابات ہوں گے۔

حاجی مستان کی دستک :-

بمبئی میں اپنے قیام کے چند گھنٹوں کے بعد میرے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے نیم خوابی کے عالم میں یہ دستک سنی اور یہ سمجھ کر کہ شاید تیز ہوا کی وجہ سے کھڑکی کے پٹ کھل گئے ہیں اسے نظر انداز کر دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ دروازے کو بیک وقت کئی افراد کھٹکھٹا رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو میں دم بخود رہ گیا۔ حاجی مستان مرزا اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ بڑے وحشت ناک موڈ میں میرے سامنے کھڑا تھا، اور مجھے یک لخت یہ احساس ہوا کہ آج کی رات، میری زندگی کی آخری رات بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے انہیں اندر آنے کے لئے کہا اور وہ بڑی خاموشی سے آکر کمرے میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے حاجی مستان کو جیل سے چھوٹنے پر مبارک باد دی اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا کہ سب آپ کی مہربانی ہے اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا میں بڑی خاموشی سے سنتا رہا۔ حاجی مستان کہہ رہے تھے کہ ''مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر پچھلے تیس ماہ سے جو مظالم ٹوٹتے رہے ہیں اس کی ساری ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔ نہ آپ اپنے اخبار میں میرا وہ انٹرویو چھاپتے اور نہ اندرا گاندھی ہم سے ناراض ہو کر ہمیں جیلوں میں ڈالتی، میرے ساتھی برابر تیس مہینے تک مجھے گالیاں دیتے رہے کہ تم نے شمیم کو وہ

انٹرویو کیوں دیا۔ میں نے ان سے ہزار بار کہا میں نے کوئی انٹرویو نہیں دیا۔لیکن انہیں میری بات کا اعتبار نہیں ۔ میں ان لوگوں کو اس لئے اپنے ساتھ لایا ہوں، کہ ان کے سامنے بتایئے کہ کیا میں نے آپ کو کبھی کوئی انٹرویو دیا ہے؟ اور اگر نہیں تو پھر آپ نے غلط ملط باتیں مجھ سے منسوب کر کے ہمیں ایسی مصیبت میں کیوں مبتلا کر دیا؟'' حاجی مستان کے لہجے میں غصہ تھا شکایت تھی اور اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں اُڑ رہی تھیں۔لیکن اس دوران میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔اس لئے میں نے بغیر کسی خوف کے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ حاجی مستان نے مجھے باقاعدہ انٹرویو نہیں دیا تھا۔لیکن انہوں نے میرے بہت سے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اپنی زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا تھا میں نے اسے پوری صحت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے حاجی مستان کو یہ احساس یا اندازہ نہیں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میرے اخبار میں شائع ہوگا اور صرف اس لحاظ سے میں وشواس گھات کا مجرم ہوں۔ میں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ میری وجہ سے اتنے لوگوں کو تیس ماہ تک ناقابل برداشت مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ اگر حاجی مستان کا انٹرویو میرے اخبار میں شائع نہ بھی ہوتا۔تب بھی سمگلروں کے خلاف کاروائی ناگزیر تھی۔ لیکن حاجی مستان اور ان کے دوسرے ساتھی میرے خیال سے متفق نہیں ہوئے۔ایک گھنٹے کی بحثا بحثی کے بعد جب میں نے حاجی مستان سے براہ راست مخاطب ہو کر پوچھا

کہ اب تم لوگوں کے کیا ارادے ہیں تو اس نے فوراً جواب دیا کہ میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ میں آج سے ایک نئی زندگی شروع کروں گا میں نے کہا کہ ایک تمہارے بدل جانے سے تو دنیا بدلے گی نہیں اس لئے تمہیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بدلنا پڑے گا۔ حاجی نے مجھ سے اتفاق کیا لیکن وہ پھر شکایت کرنے لگا کہ تم نے ہم لوگوں کو اتنا بدنام کردیا ہے کہ ہماری بات کا کسی کو اعتبار نہیں ہوگا میں نے کہا کہ میں ایک صحافی ہوں اور اس حیثیت سے میں نے جو کچھ کیا۔ میں اس پر نادم نہیں ہوں۔ لیکن اگر تم سب لوگ یہ عہد کرلو کہ تم اپنی مجرمانہ زندگی سے باز آؤ گے تو میں تمہیں تمہاری نجات کا راستہ بتا سکتا ہوں۔ تم چمبل کے ڈاکوؤں کی طرح اپنے آپ کو جے پرکاش نرائن کے سپرد کردو اور ان کے سامنے یہ عہد کرلو کہ ہم گناہ کی زندگی سے توبہ کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ میری تجویز سن کر حاجی مستان اور ان کے ساتھی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے؟ حاجی مستان کے ایک ساتھی نے پوچھا۔ ''یہ ممکن ہے اور میں اس کے لئے کوشش کرنے کے لئے تیار ہوں''۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا ''کیا ہم جے پرکاش سے نہیں مل سکتے ہیں؟ حاجی مستان نے پوچھا'' جے پرکاش جی سے ایک ایک کر کے ملنا ممکن نہیں تم سب لوگ ان سے ایک ساتھ مل لو۔ ان کے سامنے باقاعدہ حلف اُٹھاؤ کہ تم اپنے کاروبار کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اچھے شہریوں کی طرح زندگی گذارو گے۔

''ہم تیار ہیں۔ آپ جے پرکاش سے مل لیجئے''۔ حاجی مستان نے

اپنے دوسرے ساتھیوں سے صلاح ومشورہ کے بعد کہا دوسرے دن میں نے
جسلوک ہسپتال میں جے پرکاش جی کو یہ ساری روداد سنائی اور انہوں نے
اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ جے پی نے کہا کہ یہ نیک کام جتنی جلدی
ممکن ہوسکے انجام دینا چاہیئے اور انہوں نے مجھے اپنی طرف سے تمام
تفصیلات طے کرنے کا اختیار کردیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اگلے ہفتے بمبئی اور ملک
کے دوسرے حصوں میں رہنے والے سمگلر جسلوک ہسپتال میں اپنے آپ کو
جے پرکاش نرائن کے سپرد کردیں گے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۸ء

ہمیں احساس ہے!:-

''آئینہ'' کی کتابت، طباعت اور تقسیم کے متعلق دفتر کو موصول ہونے والی شکایات میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بعض اوقات اخبار کی کتابت اتنی خراب ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کا ذوقِ نفاست مجروح ہوجاتا ہے۔اور کبھی کبھی طباعت اتنی گندی کہ جو کچھ چھپا ہوا ہے وہ پریس والے کے سوا کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس پر طرہ یہ کہ صبح سے شام تک اخبار ڈھونڈتے پھرو تو تب کہیں پرچے کی صورت نظر آئے۔ بے چارے مستقل خریداروں کو بھی یہ شکایت ہے کہ ہفتے میں ایک یا دو بار ہاکر ان کا پرچہ بھی غائب کردیتا ہے مجھے ''آئینہ'' کی کتابت اور طباعت کے گرتے ہوئے معیار، اس کی تقسیم کے ناتسلی بخش انتظامات اور اس کی دوسری خامیوں کا بخوبی احساس ہے اور میں اس سلسلے میں موصول ہونے والی ۹۰ فیصد شکایات کو درست سمجھتا ہوں لیکن میں اپنے قارئین اور ''آئینہ'' کے پرستاروں کی ان تمام شکایت کا صرف ایک جواب دیتا ہوں۔اور مجھے یقین ہے کہ وہ ان کو نہ

صرف مطمئن کردے گا بلکہ انہیں غیر معین عرصے کے لئے یہ صورت حال برداشت کرنے پر بھی آمادہ کردے گا۔

آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہم کن مشکلات، مصائب اور مسائل کا سامنا کر کے ''آئینہ'' کو جاری رکھے ہوئے ہیں ان کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ وقت نہیں۔ اور نہ ان کے بیان سے کوئی فائدہ ہوگا۔ لیکن آپ کو سمجھانے کے لئے اتنی سی بات کہہ دینا کافی ہے کہ ''آئینہ'' کا چراغ گل کرنے کے لئے اور اختلاف کی یہ نحیف سی آواز دبانے کے لئے بابائے قوم جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ذاتی طور پر جس دلچسپی اور توجہ کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس کے پیش نظر ''آئینہ'' کا باقاعدگی سے شائع ہونا بھی ایک معجزے سے کم نہیں۔ کتابت سے لے کر طباعت اور تقسیم کے ہر مرحلے پر ہمیں ایسی منظّم سازشوں اور سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات میرے حوصلے میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ایسے نازک مرحلوں پر ''آئینہ'' میں کام کرنے والے میرے ساتھی، میری ہمت بندھا کر مجھے اس شمع کو ہر قیمت پر روشن رکھنے کے اپنے عہد کی یاد دلاتے ہیں۔ اور میں پھر ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ سرگرم سفر ہو جاتا ہوں میں جانتا ہوں کہ تاریکی، ظلمت استبداد اور آمریت کا یہ دور ہمیشہ قائم نہ رہے گا۔ اور ایک دن جمہوریت، انسانیت اور شرافت کی ایک نئی صبح ضرور طلوع ہوگی۔ لیکن جب تک یہ صبح روشن نہیں ہوتی، ''آئینہ'' کے قارئین اور اس کے پرستاروں کو ہماری ہر خطا، ہر کوتاہی اور خامی کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ ان کی محبت اور عقیدت پر میرا وشواس

اتنا ہی مستحکم ہے کہ جتنا موجودہ حکمرانوں کے عبرت ناک انجام پر......

۲۲ ستمبر سے قبل اور بعد :-

۲۲ ستمبر کے بعد سے شیخ محمد عبداللہ اپنے جنم جنم کے ساتھی مرزا محمد افضل بیگ پر ایسے سنگین اور نا قابل اعتبار الزامات عائد کر رہے ہیں کہ مرزا بیگ کے بدترین دشمنوں کو بھی ان کے ساتھ ہمدردی کا احساس ہونے لگا ہے۔ شیخ صاحب کو اپنے عقیدت مندوں کی جہالت اور ان کی اندھی عقیدت پر اس درجہ اعتماد ہے کہ ان کے خیال میں وہ ان کی ہر بات کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر قبول کر لیں گے ان کا یہ اندازہ کچھ غلط بھی نہیں ۔ لیکن شیخ صاحب کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ پچھلے بیس پچیس برسوں کے دوران جبکہ وہ رائے شماری اور حق خود ارادیت کی تلاش میں بخشی صاحب، صادق صاحب اور قاسم صاحب کی حکومتوں سے ماہانہ الاؤنس وصول کرنے میں مصروف تھے، اس ریاست میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک پوری نسل تیار ہوئی ہے ۔جو ہر معاملے اور ہر مسئلے پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے لیس ہے اس نسل کو درختوں کے پتوں پر کسی لیڈر کا نام نظر نہیں آتا۔ اور نہ یہ اس قسم کے توہمات اور تعصّبات کا شکار بنائی جاسکتی ہے۔ یہ نسل شیخ صاحب کے ہر بیان کو حدیث سمجھنے کی بجائے اس کا تجزیہ کرتی ہے اور اسے اپنے فہم وادراک کی روشنی میں قبول کرتی ہے یا رد کرتی ہے، ان نوجوانوں کی نگاہوں میں شیخ صاحب کی طرف سے اپنے کل کے ساتھی مرزا افضل بیگ کے خلاف الزامات کی تازہ ترین فہرست سیاسی بددیانتی، اخلاق سوزی اور انتقام گیری

کی ایک ایسی مثال ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بیگ صاحب کے خلاف متعدد الزامات میں سے دو الزام قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ۱۹۵۳ء میں پھسلنے والے تھے۔ لیکن ان کے ایک عزیز غلام محمد بیگ ذیلدار نے انہیں بچالیا (یوں کہئے کہ تباہ کردیا) دوئم یہ کہ بیگ صاحب کو شیخ صاحب کے خلاف اُکسانے میں بیرون ریاست کی کچھ طاقتوں کا ہاتھ ہے۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ شیخ صاحب کو ۱۹۵۳ء کی سازش میں بیگ صاحب کے ملوث ہوئے یا پھسل جانے کے امکان کا علم کب اور کیوں کر ہوا؟ غلام محمد بیگ ذیلدار کو اس جہاں فانی سے رخصت ہوئے کئی سال گذر گئے۔ اس لئے ظاہر ہے، کہ انہوں نے شیخ صاحب کو اس گہرے راز سے واقف نہیں کیا۔ (یا ہوسکتا ہے کہ شیخ صاحب یہ دعویٰ کریں کہ مرزا بیگ نے خواب میں آکر انہیں یہ سارا واقعہ بتادیا ہو) پھر شیخ صاحب کو یہ بات کس نے بتائی؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہیں اس کا علم کب ہوا؟ آثار وقراین سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کو مرزا افضل بیگ کے ۱۹۵۳ء کی سازش میں پھنسنے کا علم سالہال سے تھا۔ لیکن انہوں نے آج تک نا معلوم وجوہات کی بناء پر اس کا انکشاف نہ کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر بیگ صاحب کی سیاسی بصیرت ان کی دیانت اور ان کا سیاسی کردار اس درجہ مشکوک تھا۔ تو شیخ صاحب نے انہیں ۲۲ سال تک اپنی رفاقت کا شرف کیوں بخشا۔ انہیں اپنا سب سے معتبر اور مستند مشیر اور صلاح کار کیوں مقرر کیا؟ بخشی صاحب کی طرف سے دائر کردہ مقدمہ سازش سے لے کر اندرا گاندھی کے ساتھ

۱۹۷۵ء کی سازش میں انہیں اپنا وکیل اور مختار عام کیوں بنایا؟ ان کی خاطر علی محمد نائیک، خواجہ مبارک شاہ، غلام محمد بٹ بلکہ اپنے چہیتے داماد خواجہ غلام محمد شاہ کو اپنی بارگاہ اور محاذ رائے شماری سے خارج کیوں کیا؟ ۱۹۷۷ء کے بعد سے لاگو کئے گئے مرکزی قوانین کا جائزہ لینے والی کمیٹی کا سربراہ نامزد کیوں کیا۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ ۲۲ ستمبر سے صرف چار دن قبل محترم شیخ صاحب، بیگ صاحب کی رہائش گاہ پر دیئے گئے ایک خصوصی ڈنر میں مہمان خصوصی تھے کیا اس دن بھی شیخ صاحب کو یہ علم نہیں تھا کہ بیگ صاحب ۱۹۵۳ء کی سازش میں شریک تھے؟ شیخ صاحب کے اس انکشاف سے کم از کم یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو صرف بخشی غلام محمد، شری شیام لال صراف اور گردھاری لال، ڈوگرہ ہی ان سے اختلاف نہ رکھتے تھے۔ بلکہ بیگ صاحب بھی...... لیکن یہ اپنی جگہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس پر میں کسی اور وقت اپنے خیالات کو ظاہر کروں گا۔ اس وقت صرف یہ بات قابل غور ہے کہ شیخ صاحب نے کن وجوہات کی بناء پر پورے ۳۵ سال ایک ایسے ساتھی پر بھروسہ کیا کہ جس کی نیت سیاسی بصیرت اور وفاداری پر انہیں شک تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس دوران انہوں نے اس مشکوک کردار والے ساتھی کو ایک بار نہیں، متعدد بار اپنا جانشین اور خلیفہ اوّل بھی نامزد کیا۔ خدا شیخ صاحب کو کم از کم مزید ۲۲ سال تک سلامت رکھے...... لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ۲۲ ستمبر سے پہلے وہ ہمارے درمیان نہ ہوتے اس صورت میں بیگ صاحب جیسے بے بھروسہ آدمی کو اپنا جانشین نامزد کر کے کیا انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی نہیں کی تھی؟ حد یہ ہے کہ ۲۲ ستمبر کو بھی

ہمارے عظیم رہنما اور قاید نے مرزا افضل بیگ کو نئی دہلی میں منعقد ہونے والی وزراء اعلیٰ کی کانفرنس میں اپنا ترجمان اور نمائندہ بنا کر بھیجا تھا......سوال یہ ہے کہ اگر شیخ صاحب نے بیگ صاحب کے مشکوک ماضی کے باوجود انہیں اتنا بڑا رتبہ دے کر اپنا اعتماد بخشا تھا تو پھر ۲۲ ستمبر کو کون سی قیامت نازل ہوگئی کہ ان کے سارے خطابات، تمغہ جات اور صفات ان سے واپس لے کر انہیں ۱۹۵۳ء کے غداروں اور ۱۹۷۸ء کے سازشیوں میں شریک کر دیا گیا ہے؟ میری دانست میں اس سارے اُلٹ پھیر کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کا وہ خواب کہ جو ۲۵ سال تک حالات، حوادث اور اتفاقات کے ملبے تلے دب کر رہ گیا تھا۔ اور جسے ان کے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے ساتھ ہی اس ملبے سے نکال کر شاہی محل کی خواب گاہوں میں سجایا گیا ہے یعنی جب تک شیخ صاحب کے اقتدار میں آنے کا کوئی امکان یا اندیشہ نہ تھا۔ تب تک بیگ صاحب جانشین اور خلیفہ اول تھے لیکن جس تاریخ کو تاریخ نے کروٹ بدل کر انہیں اقتدار و اختیار سونپ دیا۔ اس تاریخ سے بیگ صاحب کو جانشینی کی راہ سے ہٹانے کے منصوبے پر بھی عمل درآمد شروع ہوا۔ صاف ظاہر ہے کہ بیگ صاحب کو شیخ صاحب نے اپنی محرومیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ اپنے اقتدار کا نہیں۔ کیونکہ اقتدار کے لئے ان کی نگاہوں نے اقتدار میں آتے ہی اپنے صاحبزادے فاروق کا انتخاب کر لیا تھا۔ اس لئے بیگ صاحب کا پتہ کاٹنا ضروری تھا۔ اور پتہ کاٹنے کے لئے ''سازش'' کا نسخہ آج ایک ہزار سال سے استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔

بیگ صاحب پر تازہ ترین الزام یہ ہے کہ شیخ صاحب کے ساتھ غداری کرنے کے لئے انہیں اُکسانے میں بیرون ریاست کے کچھ عناصر کا ہاتھ ہے۔ لیکن اپنے اس الزام کے ساتھ انہوں نے دو اور باتیں بھی کہی ہیں ...... ایک یہ کہ مرکزی حکومت ریاست میں سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے کی کوششوں کو پسند نہیں کرتی۔ اور دوسری یہ کہ مسز اندرا گاندھی کے ساتھ ان کے تعلقات بدستور دوستانہ اور مخلصانہ ہیں۔ اگر جنتا سرکار اور مسز گاندھی دونوں ہی شیخ صاحب کی حکومت کے استحکام اور ان کی درازی عمر کے دعا گو ہیں۔ تو پھر وہ کون سے عناصر ہیں کہ جو بیگ صاحب کو اُکسا کر شیخ صاحب کی حکومت کو ختم کرنے کے درپے ہیں؟ یہ ہم جاننا چاہیں گے۔ کہیں شیخ صاحب کے ذہن میں اپنے اداکار بھائی تامل ناڈو کے رام چندرن کا نام تو نہیں کہ جو بیگ صاحب کے ذریعے ان کی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش میں لگا ہے؟ اور ہاں ایک اور اہم سوال ان بیرونی طاقتوں نے کس تاریخ سے بیگ صاحب کو اُکسانے کا کام شروع کیا ہے۔ ۲۲ ستمبر سے پہلے یا ۲۲ ستمبر کے بعد؟

یتیم ٹرسٹ کی خدمات:۔

سیاست، صحافت اور تجارت کی اس گرم بازاری میں کچھ انسان نام و نمود انعام و اکرام اور شور شرابے سے بے نیاز ایک ایسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میرا روئے سخن ٹاک زینہ گیری کی سرپرستی میں چلنے والے اس یتیم ٹرسٹ سے ہے۔ کہ جو پچھلے

چھ سال سے ریاست کے یتیم بچوں، مفلوک الحال نوجوانوں اور بے آسرا کنبوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اس ٹرسٹ کے اہتمام سے ایک کرافٹ سنٹر اور ایک ہوسٹل بھی چل رہا ہے اور ابھی تک درجنوں یتیم اور بے آسرا طالب علموں کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ سینکڑوں بے سہارا کنبوں کی مالی کفالت بھی کی گئی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ٹرسٹ کے مالی وسائل محدود ہیں۔ لیکن ٹرسٹ کے سرپرست ٹاک زینہ گیری کا خلوص ان کی لگن اور ان تھک محنت ٹرسٹ کا ایک ایسا بیش قیمت سرمایہ ہے کہ اس کے سہارے یہ اپنی زندگی کے چھ سال پورے کر چکا ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ جموں و کشمیر یتیم ٹرسٹ کو دیئے جانے والے عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ہم توقع کرتے ہیں کہ مخیّر حضرات بڑی فیاضی کے ساتھ ٹرسٹ کو مالی امداد اور عطیات سے نوازیں گے۔ ٹرسٹ کا پتہ یہ ہے۔

جموں و کشمیر یتیم ٹرسٹ، شہید گنج سرینگر فون ۷۵۱۱۴

۱۹۷۴ء

امیر ترین شخص:-

لوک سبھا میں میرے ساتھ ایک سابق مہاراجہ بیٹھتے ہیں، ان میں بظاہر مہاراجوں والی کوئی بات نہیں نہایت ہی شریف، خاموشی پسند اور ہنگامہ آرائی سے دور بھاگنے والے، بھرا بھرا گول چہرہ، لمبی لمبی قلمیں اور خوبصورت مسکراتی ہوئی آنکھیں، پارلیمنٹ کی کاروائی میں شاذ ہی کوئی حصہ لیتے ہیں۔ ایکبار تقریر کی تھی اور وہ بھی اس وقت کہ جب سابق والیان ریاست کی ''جیب خاص'' کو ختم کرنے کے بل پر بحث ہو رہی تھی۔ پہلے کانگریس میں تھے، نہرو کے زمانے میں کرشنا مینن کے ماتحت نائب وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ کانگریس کی تقسیم کے بعد کچھ عرصہ تک تنظیمی کانگریس کے ساتھ تھے، لیکن پچھلے سال اس سے مستعفی ہو کر اب بطور آزاد ممبر کے بیٹھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں کبھی کبھار ہی حاضری دیتے ہیں۔ اور اکثر میرے پاس آکر

بیٹھتے ہیں۔ یا میں ان کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔ جس وقت ایوان میں کوئی تھکا دینے والی بورنگ تقریر ہو رہی ہو تو مہاراجہ صاحب اور میں ایک دوسرے کو لطیفے سنا کر من بہلاتے ہیں انہیں تقریروں پر میری ''رننگ کمنٹری'' بہت پسند ہے اور وہ میرے ایک ایک جملے پر بے تحاشا ہنس دیتے ہیں۔ معاف کیجئے کہ مہاراجہ صاحب کے متعلق یہ سب غیر ضروری باتیں بتانے کے بعد ابھی تک میں نے آپ کو ان کا نام نہیں بتایا۔ ان کا نام ہے فتح سنگھ گائیکواڑ۔ ہندوستان کا امیر ترین شخص، گائیکواڑ صاحب کے متعلق مجھے پرسوں تک یہ بات خود بھی معلوم نہیں تھی کہ وہ اس ملک کے سب سے امیر شخص ہیں۔ اخباروں میں یہ بات آگئی، تو مجھے حیرت ہوئی کیونکہ گائیکواڑ صاحب کے چہرے بُشرے سے امیری تو جھلکتی ہے۔ لیکن ''امیر ترین شخص'' ہونے کی کوئی بات نہیں ٹپکتی۔ اب جو میں ان سے مل کر یہ کہوں گا کہ آپ تو چھپے رستم نکلے، تو وہ مسکرا کر کہیں گے۔ ''اماں یار رہنے بھی دو، کیوں مذاق کرتے ہو''۔ ہندوستان کا امیر ترین شخص بہت شریف، کم گو اور پیارا آدمی ہے!۔

لون صاحب کا ''جرم'':-

ہالی وڈ کی مشہور ایکٹریس ''مارلن منرو'' سے کسی نے کہا تھا کہ ''میڈم، ان دنوں آپ کی بہت بُری پبلسٹی ہو رہی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟'' تو اس نے جواب دیا تھا۔'' کہ پبلسٹی کی دنیا میں بُری پبلسٹی نام کی کسی چیز کا وجود نہیں۔ پبلسٹی بہر حال پبلسٹی ہوتی ہے۔ ریاستی کابینہ کے نوجوان وزیر عبدالغنی لون کو ان دنوں جو پبلسٹی مل رہی ہے۔ اس سے یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ ریاست

کی سیاست اور حکومت کا سب سے اہم اور کلیدی پرزہ ہے، سرینگر سے شائع ہونے والے بعض معاصرین کے ہر شمارے میں لون صاحب کی اتنی پبلسٹی ہوتی ہے کہ ان پر خصوصی لون نمبر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ کارٹون، مزاحیہ کالم اور بعض اوقات ایڈیٹوریل کا موضوع بھی لون صاحب ہی ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحبان سماج، سیاست، مذہب، معیشت، تعلیم صحت اور سیاحت میں ہر بُرائی کے لئے لون صاحب ہی کو ذمہ دار سمجھتے ہیں، اور ان کے نزدیک وزیر موصوف کے خلاف جہاد کرنا اصل ایمان ہی نہیں عین ایمان ہے۔ مدیرانِ کرام کے پاس لون صاحب کے خلاف جہاد کے لئے یقیناً معقول وجوہات ہوں گی لیکن ابھی تک انہوں نے اپنے قارئین کو یہ نہیں بتایا ہے کہ عبدالغنی لون کا جرم کیا ہے؟ وزیروں کے خلاف لکھنا ان کی ہر بدعنوانی اور بے ضابطگی کا پردہ چاک کرنا صحافیوں کے فرائض میں شامل ہے۔ اور میں نے اپنی صحافتی زندگی میں کماحقہ یہ فرض ادا کیا ہے۔ لیکن میرے ہم عصر مجھے معاف کریں گے کہ مجھے ابھی تک لون صاحب کی سیاسی زندگی، ان کے عوامی کردار، اور ان کی انتظامی صلاحیتوں میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی کہ جس کی بنیاد پر ان کے خلاف محاذ آرائی کا کوئی جواز نکل آئے۔ میں وزیروں کی مدافعت اور وکالت کو معیاری صحافت کے شایانِ شان نہیں سمجھتا لیکن حق یہ ہے کہ ریاستی کابینہ میں لون صاحب کا وجود غنیمت ہے۔ وہ نوجوان ہیں جوشیلے ہیں، ان میں کام کرنے کی ہمت بھی ہے اور فیصلہ کرنے کا حوصلہ بھی، خوش قسمتی سے ابھی تک ان کا دامن بدعنوانیوں اور

بے ضابطگیوں کی آلائش سے پاک ہے اور اس قحط الرجال میں ہمیں ایسے آدمیوں کی قدر کرنا چاہیئے۔ ذاتی ناراضگی اور شخصی رنجشوں کو صحافت اور تنقید کا معیار بنانا، صحافت کے وقار کو کم کردے گا۔ یہ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ہم لوگ گردھاری لال ڈوگروں اور تریلوچن دتوں کی بے ایمانیوں اور بدعنوانیوں پر تو خاموش رہیں۔ لیکن لون صاحب جیسے دیانتدار نوجوان کے خلاف صف آراء ہو جائیں۔ میں لون صاحب کو یہ یقین دلانا چاہوں گا کہ جب تک وہ ایمانداری اور دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیں۔ اخباری تنقید اور مزاح نویسی کے باوجود عوام میں ان کی قدر و منزلت بڑھتی رہے گی!

ذاتی تعلقات اور سیاسی حالات:۔

پچھلے سال ریاست میں داخلے پر پابندی ختم ہونے کے بعد جب شیخ صاحب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے پہلی بار ملے تو دونوں لیڈروں نے ایک نیا باب شروع کرنے کا ذکر کیا تھا۔ سیاسی سطح پر اگرچہ بیگ پارتھا سارتھی ''مونولاگ'' کے باوجود ابھی تک اس نئے باب کا حرفِ آغاز بھی نہیں لکھا جا سکا ہے۔ لیکن مسز گاندھی اور شیخ صاحب کے ذاتی تعلقات پہلے کی طرح استوار اور خوشگوار ہونے کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ پچھلے ماہ جب بیگم شیخ محمد عبداللہ نئی دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں زیر علاج تھیں، تو ایک دن مسز گاندھی اپنے بیٹے اور بہو کے ہمراہ بیگم صاحبہ کی عیادت کے لئے تشریف لائیں۔ شیخ صاحب اس وقت وہاں موجود نہیں تھے اور مسز گاندھی تقریباً بیس پچیس منٹ تک بیگم عبداللہ کی مزاج پُرسی کرتی

رہیں۔ اس کے بعد شیخ صاحب کے فرزند طارق عبداللہ کو ہندوستان لوٹنے کے لئے خصوصی ویزا جاری کرنے میں وزیراعظم نے ذاتی طور پر گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور یہ ان ہی کی توجہ کا نتیجہ ہے کہ طارق صاحب جن کا ہندوستانی پاسپورٹ حکومت ہند نے منسوخ کر دیا تھا، دس سال کے بعد وطن لوٹ آئے ہیں، پچھلے دنوں وزیراعظم نے شیخ صاحب بیگم عبداللہ اور طارق عبداللہ کو چائے پر مدعو کیا تھا اور ایک مدت کے بعد دونوں خاندان ایک جگہ جمع ہوئے۔ اس ملاقات کے دوران اگرچہ شیخ صاحب اور مسز گاندھی کے درمیان اور کوئی سیاسی گفتگو نہیں ہوئی۔ تاہم یہ ملاقات بجائے خود ایک اہم واقعہ ہے۔ بیگم صاحبہ کے ہسپتال سے گھر لوٹ آنے پر وزیراعلیٰ سید میر قاسم اور سید حسین کی بیگمات بھی بیگم صاحبہ کی مزاج پرسی کے لئے ۳ کوٹلہ لین تشریف لے گئیں۔ قاسم صاحب ہسپتال میں ہی عیادت کی غرض سے گئے تھے۔ کیا ذاتی تعلقات کی یہ بحالی اور خوشگواری سیاسی صورت حال میں کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی؟ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔

جولائی ۱۹۷۳ء

مجاہدین آزادی کی نمائش :-

۱۵/اگست کو نئی دہلی میں مجاہدین آزادی کی نمائش کے سلسلے میں مختلف ریاستوں سے جو ''نمونے'' بھیجے گئے تھے ان کے متعلق تقریباً ہر ریاستی حکومت پر یہ الزام عائد کیا جارہا ہے۔ کہ ارباب حکومت نے اس انتخاب میں بے ایمانی اور بددیانتی سے کام لے کر مستحق، موزون اور اصلی مجاہدوں کو نظر انداز کر دیا، اور ان کی جگہ کچھ ''اخلاقی مجرموں'' ناپسندیدہ عناصر اور بددیانت سیاسی کارکنوں کو دلی کی سیر کرائی۔ دوسری ریاستوں کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ریاست جموں وکشمیر سے اس نمائش میں جو ''نمونے'' بھیجے گئے تھے وہ یقیناً اپنے مجاہدانہ کارناموں کی بجائے ڈپٹی کمشنروں کی پیٹھ اور کانگریسی کھڈپنچوں کے کاندھے پر سوار ہو کر دلی پہنچے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ان میں بعض ایسے بھی لوگ تھے کہ جنہوں نے تحریک آزادی کے دوران قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ لیکن چونکہ ان سے زیادہ ظلم وستم، قید و بند اور جسمانی عذاب سہنے والے بزرگ نظر انداز

کردیئے گئے تھے، اس لئے یہ بات ظاہر ہوگئی، کہ مجاہدین کے انتخاب میں
قربانی سے زیادہ حاکموں کی مہربانی کا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ریاست
سے ایک بھی ایسا نمونہ نمائش میں شامل نہ تھا کہ جس کی قربانی ، ایثار
اور مجاہدانہ کارنامے ہمارے لئے قابلِ فخر اور قابل تقلید ہوسکتے تھے۔ تحریک
آزادی کی ابتداء ۱۹۳۱ء میں سرینگر سے ہوئی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ
سرینگر سے ایک بھی نام مجاہدین آزادی کی سرکاری فہرست میں شامل نہ تھا۔
اس کے برعکس دیہات کے کچھ معصوم ، بے ضرر بزرگوں کو مجاہدین آزادی کا
الزام دے کر ریاستی حکومت نے یہ بات ثابت کردی کہ راشن کی تقسیم ہو یا
سرکاری ملازمت کے لئے اُمیدواروں کا انتخاب ، یہ حکومت بے ایمانی
بددیانتی ، اقرباپروری اور من مانی سے باز نہیں آسکتی۔ قانون ساز اسمبلی میں
جب کچھ ممبروں نے مجاہدین آزادی میں ملاوٹ کے اس رویے پر اعتراض
کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ اس فہرست میں شیخ محمد عبداللہ،
مرزا محمد افضل بیگ مولانا مسعودی ، غلام محی الدین قرہ جیسے ممتاز اور بزرگ
رہنماؤں کا نام کیوں نہیں ہے تو ریاست کے وزیراعلیٰ سید میر قاسم نے ان
بزرگوں کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یہ عذر پیش کیا کہ
مجاہدین آزادی کو چونکہ یوم آزادی پر ایک جلوس میں شرکت کرنا تھی ۔ اور یہ
سبھی بزرگ اس جلوس میں شرکت نہ کرسکتے تھے، اس لئے ان کا نام شامل
نہیں کیا گیا۔ شیخ صاحب ، بیگ صاحب ، مسعودی صاحب اور قرہ صاحب
کے لئے یہ عذر قابل قبول ہے لیکن ان بزرگوں کے علاوہ بھی تو کچھ لوگوں

نے اپنا لڑکپن اور اپنی جوانی آزادی کی راہ میں نچھاور کر کے ہمارے مستقبل کو سنوارا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ مجاہدین آزادی کے اس جلوس میں شرکت کو باعث فخر سمجھتے۔ لیکن چونکہ حکومت کی نگاہوں میں مجاہدوں کے لئے صرف مجاہد ہونا ہی نہیں بلکہ پسندیدہ ہونا بھی ضروری قرار پایا تھا۔ اس لئے ان کا نام رہ گیا۔ پیر محمد افضل مخدومی، غلام محی الدین ہمدانی، علی محمد طارق، حاجی محمد سبحان، شیام لعل صراف، پنڈت کشیپ بندھو، مفتی جلال الدین کے علاوہ سینکڑوں نام ایسے ہیں کہ جو فوراً ہی ذہن میں آجاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے تحریک کی ابتداء سے لے کر آخر تک بے مثال قربانیوں اور قابل تقلید ایثار کا مظاہرہ کیا ہے۔ طارق صاحب نے تو اپنے بچپن سے ہی آزادی کی تحریک میں حصہ لیا ہے اور ۱۹۴۷ء تک برابر قربانیاں دیتے رہے ہیں، اور ان کے لئے یقیناً جلوس میں شریک ہونا ناممکن نہ ہوتا...... لیکن وہ غالباً ''پسندیدگی'' کے اس معیار پر پورا نہیں اُترتے کہ جو قاسم صاحب اور اس دور کے نئے ''مسیحا'' مفتی محمد سعید نے مقرر کر رکھا ہے۔ آزادی کی جدوجہد میں کسی شخص کی شرکت، اس کا ایثار اور اس کی قربانی، تاریخ کا ایک حصہ ہے اور کم از کم اس معاملے میں حکومت کو جھوٹ، فریب اور ریاکاری سے کام نہ لینا چاہئے تھا۔ لیکن جب کسی چیز کی چاٹ پڑ جائے۔ تو پھر اس سے دامن بچانا مشکل ہے اور ہماری حکومت کو جھوٹ کی چاٹ پڑ گئی ہے!

وید راہی کی ''دراڑ'':۔

وید راہی میرے ان دوستوں میں سے ہیں، کہ جن کے لئے میرے

دل میں محبت اور شفقت ہی نہیں عزت واحترام بھی ہے۔ بارہ سال قبل ہم دونوں محکمہ اطلاعات میں ایڈیٹر تھے میں اُردو رسالے ''تعمیر'' کا اور وہ ہندی میں شائع ہونے والے ''یوجنا'' کے، دونوں سرکاری ملازمت سے نا آسودہ ہی نہیں، بیزار بھی تھے اور کسی طرح رسی تڑا کر بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ویدراہی کہانیاں لکھتے تھے اور ان کی نظر بمبئی پر تھی، میرے دماغ میں سیاست کا کیڑا تھا۔ اور میں علی گڈھ جا کر ایل۔ایل۔بی کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن وید نے مجھے بتایا کہ وہ نوکری چھوڑ کر بمبئی جا رہا ہے اور وہاں فلموں کے لئے کہانیاں لکھے گا۔ میں سمجھا کہ مجھ پر دھونس جما رہا ہے کہاں جائے گا۔ لیکن پھر ایک دن وہ دفتر نہیں آیا۔ اور اس کے والد لالہ ملک راج صراف نے یہ اعلان کر دیا، کہ وید بمبئی گیا ہے اور وہ اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ وید کے بمبئی چلے جانے کے بعد مجھے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ میں رسی تڑا کر بھاگ سکتا ہوں، لیکن مجھے رسی توڑنے میں ٹھیک آٹھ سال لگے۔ جبکہ وید تین ہی سال کے بعد کامیاب ہو گیا۔ ویدراہی نے اپنی محنت، ریاضت اور خداداد صلاحیتوں سے بمبئی کی فلمی دنیا میں اپنے لئے ایک محفوظ جگہ بنا لی ہے۔ وہ کئی فلموں کی کہانیاں اور بہت سی فلموں کے مکالمے لکھ چکا ہے اور اب اس نے ہدایت کاری کے میدان میں بھی قدم رکھا ہے۔

پچھلے دنوں مجھے اس کی ہدایت میں بننے والا پہلا فلم ''دراڑ'' دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت کا احساس ہو رہا ہے کہ ''دراڑ'' دیکھ کر ویدراہی کی صلاحیتوں پر میرا ایمان اور اعتقاد پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو گیا

''دراڑ'' وید کی اپنی ہی ایک کہانی پر مبنی فلم ہے اور جس خوبصورتی اور خوش مذاقی سے اس نے اس کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیئے ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وید نے بمبئی میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک سچے فن کار کی طرح ریاض کیا ہے۔ ''دراڑ'' یقیناً باکس آفس کے نکتہ نظر سے کامیاب فلم ثابت نہیں ہوسکتا اور مجھے خوشی ہے کہ اپنی اولین پیشکش میں وید راہی نے باکس آفس سے زیادہ فنی معیار، موضوع سے وفاداری اور تجربے کی صداقت کو زیادہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ فلم کی کہانی بظاہر ایک نوبیاہتا جوڑے کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن اس میں ہمارے معاشرے کے بہت سے تضادات اور ہماری زندگی کی بہت سی رنگینیاں سما گئی ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں انسانی تعلقات کا ڈرامہ، افراد کی نفسیاتی کشمکش اور محبت کا زیر و بم شروع سے آخر تک ایک ایسا ماحول تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ جس میں دیکھنے والا اپنے آپ کو کرداروں کی خوشیوں اور مسرتوں غموں اور مصیبتوں میں برابر کا شریک سمجھتا ہے جنگ کی بے رحمی اور بے مروتی کو وید راہی نے جس فنکارانہ شدت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے پیش نظر اس فلم کو امن کے موضوع پر ایک بہت اچھا فلم قرار دیا جاسکتا ہے۔ وید نے جنگ کے خلاف پروپگنڈا کرنے کی بجائے اس سے پیدا شدہ ایک انفرادی المیے کو پوری انسانیت کا درد بنا کر پیش کیا ہے اور یہی اس کا کارنامہ ہے۔ نقطہ عروج پر پہنچتے وقت اگر چہ کہانی کچھ کمزور پڑ جاتی ہے اور اس میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے کچھ بہترین مواقع ضائع

کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ویدا پنا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہدایت کار نے وضاحت کی بجائے رمزیت اور ایمائیت سے کام لے کر بہت دیرپا تاثر پیدا کیا ہے۔ فلم کے گانے اوسط درجے کے ہیں اور مکالموں پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ تقریباً سارا فلم آوٹ ڈور میں تیار ہوا ہے اور کہیں بھی غیر ضروری تصنع سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ''دراڑ'' ایک ایسا صاف ستھرا فلم ہے کہ جسے خوش مذاق اور بالغ ذہن ہی پسند کریں گے۔ یہ ویدراہی کا ایک بہت ہی جرأت مندانہ تجربہ ہے۔ اور اگر وہ اس روش پر قائم رہے تو ہم ان سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر سکتے ہیں۔

جموں اور جن سنگھ :-

اس وقت جبکہ پورے ملک میں جن سنگھ کو بے پناہ مار پڑ رہی ہے۔ ریاست کے ضلع جموں میں اس کی بڑھتی ہوئی قوت اور مقبولیت حیران کن بھی ہے اور پریشان کن بھی۔ اسمبلی کے حالیہ انتخابات اور اب میونسپل انتخابات میں جن سنگھ کی زمین کھسکانے والی (Landslide) جیت نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ پچھلے چند سالوں کے دوران جن سنگھ نے حکمران جماعت کے اندرونی خلفشار اور سیکولر طاقتوں کی پراگندگی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی پوزیشن بہت مضبوط بنالی ہے اور باوجود اس کے کہ جموں میں اس جماعت کی قیادت کچھ پڑھے لکھے جاہلوں اور کچھ اَن پڑھ سند یافتوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے اپنے لئے ایک عوامی اساس پیدا کر لی ہے اور ادوہم پور اور کٹھوعہ کے بعد اب جموں شہر میں بھی جن سنگھیوں کا سکہ چلنے لگا ہے۔ جن

سنگھ کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت کے لئے اگر کسی کو ذمہ وار قرار دیا جا سکتا ہے
تو وہ ہے حکمران جماعت اور اس کے خود ساختہ لیڈر، جموں میں قوم پرستی کے
دعویدار اکثر کانگریسی لیڈروں نے کشمیری لیڈروں کے ساتھ سودا بازی
کرنے میں ہمیشہ جن سنگھ کو خوش رکھنے کی پالیسی پر عمل کیا، بلکہ بعض اوقات
ان کے ساتھ خفیہ سمجھوتے بھی کئے، جموں کانگریس ان بدنام اور بدکردار
سیاسی یتیموں کی آماجگاہ بن گئی کہ جن کا وجود کسی بھی سیاسی تنظیم کے لئے
باعث ننگ ہے۔شروع شروع میں ڈاکٹر کرن سنگھ جن سنگھ کے خلاف ایک
مضبوط گڑھ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن وہ جلد ہی راجپوتی سیاست
کے بکھیڑوں میں اُلجھ کر رہ گئے: بدقسمتی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب عملی سیاست
میں قدم رکھنے کے باوجود ذہنی طور اپنے عالیشان محلات میں اسیر ہیں، وہ
اپنی تقریر کی لذت اور تحریر کی چاشنی پر عاشق ہیں اور بس، باقی دنیا جائے بھاڑ
میں، یہی وجہ ہے کہ جموں میں ان کے بے پناہ اثر و رسوخ کے باوجود جن سنگھ
نے اسمبلی کے حالیہ انتخابات میں اُنہیں بُری طرح شکست دی اور اس طرح
ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنے وقار کے ساتھ ساتھ کانگریس کے وقار کو بھی مجروح
کر دیا۔ اور آج جموں پر باقاعدہ جن سنگھ کا پرچم لہرا رہا ہے۔ کشمیر میں حکمران
کانگریس نے میونسپل انتخابات میں پارٹی سطح پر انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ
کر کے بزعم خود اپنی عزت بچالی۔ لیکن جموں میں کانگریس نے باضابطہ
جماعتی سطح پر انتخاب لڑ کر جن سنگھ کے ہاتھوں جس بُری طرح مار کھائی ہے۔
اس سے حکمران جماعت کے کاغذی چیتوں کو اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ وہ کتنے

پانی میں ہیں۔ یہ سولہ سال کے بعد پہلا میونسپل انتخاب ہے اور پہلے ہی انتخاب میں جموں اور کشمیر دونوں ہی کانگریس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سید میر قاسم یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے سکتے ہیں کہ میونسپل انتخابات میں جن سنگھ کی کامیابی سے ان کے سیاسی اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے لیکن انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ طوفان سے پہلے کبھی کبھی اس طرح کالے بادل چھا جاتے ہیں، جس طرح اس وقت جموں کی سیاسی فضا پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں اپنے اقتدار سے زیادہ ان اصولوں کی عزت و آبرو کا خیال رکھنا چاہئے کہ جن سے وابستگی کا وہ اکثر دم بھرتے ہیں۔ اس بات کا زبردست اندیشہ ہے کہ ان کے اقتدار کو کوئی فوری خطرہ لاحق ہوئے بغیر ان اصولوں اور آدرشوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے کہ جن کی بنیاد پر ہندوستان اور کشمیر کے درمیان باہمی تعلق قائم ہوا تھا۔ میری اطلاع یہ ہے کہ میر قاسم صاحب کی کابینہ کے کچھ وزیروں اور پردیش کانگریس کے کچھ سرکردہ نیتاؤں نے کشمیری قیادت کو نیچا دکھانے کے لئے باقاعدہ جن سنگھ سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے قاسم صاحب کو آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے!

۱۲......جون ۱۹۷۵ء:-

۱۲ جون کا دن اپنی نحوست اور ہنگامہ خیزی کے اعتبار سے سال رواں کی سب سے ناقابل فراموش تاریخ کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا۔ اس صبح میں مرکزی وزیر داخلہ شری برہمانند ریڈی کے ساتھ ائرفورس کے اُس خصوصی جہاز میں دہلی جانے والا تھا کہ جو ریڈی صاحب کو ایک دن قبل شمالی زون کے وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے سرینگر لایا تھا۔ وزارت داخلہ کے وزیر مملکت شری اوم مہتہ بھی اسی جہاز سے واپس جارہے تھے اور انہوں نے ہدایت دی تھی کہ ہم سب ٹھیک ساڑھے سات بجے صبح ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں وزیر داخلہ مسٹر ریڈی اور مسٹر اوم مہتہ کے علاوہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ بھی اپنا دورہ مختصر کر کے دہلی جارہے تھے اور ہریانہ کے بنسی لال کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ کل رات ہی دہلی پہنچ گئے ہیں ۔ مرکزی وزراء اور ریاستی وزرائے اعلیٰ کا اپنا سارا پروگرام منسوخ

کر کے دہلی لوٹنے کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں تھیں۔اور ۱۱ جون کی شام ہی کو مجھے ایک ہرفن مولا دوست نے یہ اطلاع دی تھی کہ کل ۱۲ جون کو دہلی ہی میں نہیں پورے ملک میں ایک زلزلہ آئے گا۔ان کا اشارہ مسز اندرا گاندھی کے خلاف انتخابی عذرداری کے اُس فیصلے کی طرف تھا کہ جوالہٰ آباد ہائی کورٹ صادر کرنے والی تھی۔ میرے دوست کا کہنا تھا کہ یہ فیصلہ مسز گاندھی کے خلاف ہونے والا ہے اور وزیر اعظم کو چونکہ اس کا علم ہو چکا ہے۔اس لئے وہ اپنے تمام ساتھیوں کے علاوہ کانگریسی وزرائے اعلیٰ سے بھی مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے اپنے دوست کی فراہم کردہ اطلاع پر یقین تو نہیں آیا، لیکن کانگریسی وزیروں کی بدحواسی اور وزرائے اعلیٰ کی جلد بازی کا دوسرا کوئی جواز بھی نظر نہیں آ رہا تھا!

۱۱ر جون کی شام کو وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کی طرف سے صدر جمہوریہ شری فخر الدین کو ایک عشائیہ دیا گیا تھا۔اور اس کے خاتمے پر جب میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ میں کل علی الصباح دہلی جا رہا ہوں تو انہوں نے کہا ''میری طرف سے ڈی، پی صاحب کی خبر خیریت بھی پوچھ آنا۔اور کل صبح میں ان کے لئے کچھ پھول بھی بھیج دوں گا۔ وہ بھی ہسپتال میں انہیں دے آیئے!

۱۲ر جون کو صبح سات بجے کے قریب امرت ملہوترہ شیخ صاحب کی طرف سے ڈی پی کے لئے ایک خوش نما اور رنگین گلدستہ لے آئے۔اس کے ساتھ شیخ صاحب نے اپنے ہاتھ سے ایک کارڈ پر یہ الفاظ لکھے تھے: ''خدا

کرے کہ آپ جلد صحت یاب ہوں، نیک خواہشات کے ساتھ۔''

ساڑھے سات بجے ہم ہوائی اڈے پر تھے، اور سب لوگ برہمانند ریڈی کا انتظار کر رہے تھے کچھ دیر بعد پنجاب کے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ بھی آ گئے لیکن ریڈی صاحب اور مہتہ صاحب دونوں مفقود الخبر تھے! آٹھ بج گئے، پھر سوا آٹھ اور اب ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ آٹھ چالیس پر کسی نے یہ منحوس خبر سنائی کہ ڈی پی در سور گباش ہو گئے ہیں اور روز یر داخلہ، شیخ صاحب کے ہمراہ گپکار روڈ پر واقع ان کی قیام گاہ پر ان کی والدہ سے اظہار تعزیت کرنے کے لئے گئے ہیں۔ ڈی پی کی موت کی خبر سن کر ائر پورٹ پر موجود سبھی لوگ دم بخود رہ گئے۔ میں ڈی پی کے لئے پھول لے کر جا رہا تھا اور ڈائریکٹر تواضع مسٹر بسو اس کے ہاتھ میں بھی ایک گلدستہ تھا، جو وہ ڈی پی کے لئے بھجوا رہے تھے، اب یہ پھول ان کی میت پر چڑھائے جائیں گے، بسواس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور میں اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا!

کچھ دیر بعد ریڈی صاحب اور مہتہ صاحب تشریف لائے اور ٹھیک نو بجے ہمارا جہاز دہلی کے لئے روانہ ہوا۔ رستے بھر ریڈی صاحب، مہتہ صاحب، گیانی ذیل سنگھ اور میں، ڈی پی کی باتیں کرتے رہے، اوم مہتہ سے بات چیت کے دوران جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ الہٰ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ مسز گاندھی کے خلاف ہونے والا ہے تو ان کے ردِ عمل سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں بھی یہی خدشہ ہے لیکن انہوں نے ابھی تک اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں

چھوڑا تھا۔ ریڈی صاحب بہت کم گو آدمی ہیں اور ان کے چہرے بشرے سے
یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ در صاحب کی موت پر رنجیدہ ہیں یا الہٰ آباد ہائی
کورٹ کے متوقع فیصلے نے انہیں بے حد سنجیدہ بنا دیا ہے۔ بہر حال، گیارہ
بجے ہوائی جہاز سے اُترتے ہی جب انہیں یہ بتایا گیا کہ مسز گاندھی کا انتخاب
کالعدم قرار دیا گیا ہے تو ان کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور مجھے
ایسا محسوس ہوا کہ ان کے لئے یہ خبر بے حد غیر متوقع تھی!

ہوائی اڈے سے میں سیدھا ۵- پرتھوی راج روڈ گیا کہ جہاں ڈی پی
صاحب کی میت پہنچا دی گئی تھی۔ یہاں ایک جم غفیر تھا۔ عزیز و اقارب،
دوست احباب، بیرونی سفارت خانوں کے بڑے بڑے افسر، اخبار نویس،
فوٹو گرافر، مرکزی وزراء اور سینکڑوں وہ لوگ، جو ڈی پی صاحب کو کسی نہ کسی
طور جانتے تھے۔ میرے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھا اور اس کے ساتھ
شیخ صاحب کے کارڈ پر ان کے تحریر کردہ یہ الفاظ کہ "خدا کرے کہ آپ جلد
صحت یاب ہوں!" میں نے اشک بار آنکھوں سے یہ دونوں چیزیں ڈی پی
صاحب کو پیش کر دیں لیکن وہ پھولوں کی خوشبو اور دُعاؤں کی تاثیر، ہر
چیز سے بے نیاز ہو چکے تھے!

صبح دس بجے الہٰ آباد ہائی کورٹ نے اپنا وہ تاریخی فیصلہ سنا دیا تھا کہ
جس نے ہندوستان کے سیاسی سمندر میں ایسی طوفانی لہریں پیدا کر دی ہیں
کہ جو ہندوستان کا سیاسی جغرافیہ نہ سہی، اس ملک کی سیاسی تاریخ بدلنے کے
لئے بے تاب نظر آتی ہیں...... دہلی میں اس دھماکے کی گونج کچھ زیادہ ہی

زور سے سنائی دے رہی تھی اور صورت حال کا ذرا قریب سے مطالعہ کرنے کے لئے میں صفدر جنگ رو، پر واقع وزیراعظم کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا وزیراعظم کی قیام گاہ کے باہر سینکڑوں کاریں کھڑی تھیں، گیٹ پر اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں کے کچھ جانے پہچانے چہرے نظر آئے، جو مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپک پڑے، وہ یقیناً ہائی کورٹ کے فیصلے کے متعلق میری رائے جاننا چاہتے تھے، اور میں یقیناً اپنی رائے فی الحال محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اس لئے میں انہیں دیکھتے ہی گیٹ کے اندر داخل ہو گیا اور اس طرح ان کی جرح سے محفوظ رہ گیا!

اندر چاروں طرف مایوسی چھائی ہوئی تھی، ایسا لگ رہا تھا کہ آج باغیچے کے پھول بھی اُداس ہیں! باہر والے کمرے میں یش پال کپور سے ملاقات ہوئی ان کے چہرے پر مایوسی وملال کا کوئی تاثر نظر نہیں آیا۔ وہ بڑے اطمینان سے فون پر کسی کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ پھر مجھے اندر والے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کانگریس کے موجودہ صدر مسٹر بروا اور سابق صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما، بھگوت جھا آزاد (ایم پی) اور کچھ دوسرے لوگ بیٹھے تھے، ایک کمرے میں جگ جیون رام، چوان اور دوسرے سینئر وزیر بیٹھے باہمی صلاح ومشورہ کر رہے تھے۔ مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ سدھارتھ شنکر رے اور بمبئی پی، سی، سی کے پریزیڈنٹ رجنی پٹیل ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑتے نظر آرہے تھے، اندر کمار گجرال اور کے سی پنت بھی کچھ دیر کے لئے آگئے۔ ہر شخص کے چہرے پر مایوسی اور

مردنی چھائی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد وزیر اعظم باہر تشریف لائیں۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس مسکراہٹ میں آج کوئی جان نہیں! اور وہ صرف اپنے اندرونی کرب کو چھپانے کے لئے مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ویسے بھی ان کے لئے مسکرانے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور معلوم ہوا کہ صبح سویرے ڈی پی صاحب کی موت کی خبر سن کر وہ زار زار روئیں اور اس کے چند ہی گھنٹوں بعد، الہٰ آباد ہائی کورٹ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ جو خود مسز گاندھی کی سیاسی موت کا عنوان ہو سکتا ہے! صدر کانگریس اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے مختصر سی بات چیت کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ مسز گاندھی کو مستعفی ہونے کی بجائے، اپنے منصب پر قائم رہنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔ میں نے دبی زبان میں یہ صلاح دی کہ مسز گاندھی کو فوراً اپنے مستعفی ہونے کا اعلان کر دینا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی کانگریس پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ طلب کر کے ایک جانشین وزیر اعظم منتخب کیا جانا چاہیئے کہ جو سپریم کورٹ میں اپیل کا فیصلہ ہونے تک ان کی جگہ وزیر اعظم رہے اور اگر فیصلہ ان کے حق میں ہوا تو وہ دوبارہ پارٹی لیڈر منتخب ہو سکتی ہیں۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اگر مسز گاندھی نے فیصلے کا اعلان ہوتے ہی اپنے مستعفی ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہوتا تو ان کے وقار میں کمی ہونے کے بجائے غیر معمولی اضافہ ہوتا! ان کا مستعفی ہونا اگر چہ قانونی اعتبار سے ضروری نہیں تھا لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے یہ قدم خود ان کے لئے بہت فائدہ مند رہتا۔ بہر حال اتنے بڑے نقار خانے میں اس طوطی کی آواز کون سنتا، اس لئے کچھ دیر بعد میں اس

مایوس کن فضاء سے باہر آ کر کشمیر ہاؤس کے ماتمی ماحول میں لوٹ آیا۔

ساڑھے تین بجے کے قریب ایئر فورس کے ایک خاص طیارے میں ڈی پی صاحب کی میت کو سرینگر لایا گیا۔ اور میں بھی ان کی لاش کے ہمراہ اُسی طیارے سے سرینگر لوٹا۔

ہفت روزوں کی ''روزی'':۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اخبار والوں کے لئے بے خبری کے عنوان سے اس اخبار کی ایک حالیہ اشاعت (۷ جون) میں میں نے ریاست میں ہفت روزہ صحافت کا ایک جائزہ پیش کیا تھا۔ اس جائزے کی شان نزول، ویکلی نیوز پیپرس ایسوسی ایشن کا وہ طویل میمورنڈم تھا کہ جو ۳۰ مئی کو وزیر اعلیٰ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ میں اگرچہ خود کسی ہفت روزہ انجمن کا ممبر نہیں لیکن ایک ہفتہ وار اخبار کا مدیر ہونے کے ناطے مجھے یقیناً ان مسائل اور موضوعات سے گہری دلچسپی ہے کہ جن سے مجھے اور میرے دوسرے ہم پیشہ ساتھیوں کو کوئی مفر نہیں۔ ہفت روزہ صحافت سے اپنے اس تعلق کی بناء پر میں نے اپنے جائزے میں ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جو میری نگاہ میں ہفت روزہ اخبارات اور جرائد کے وزن، وقار اور مرتبے کو گھٹا کر ہم سب کی ذلت اور رُسوائی کا باعث بن رہی ہیں۔ میں نے بڑے خلوص اور نیک نیتی سے ہفت ناموں کے مدیران محترم کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ روزناموں کی چکا چوند سے مرعوب ہوئے بغیر اپنے جرائد کا معیار بلند کریں۔ اور احساسِ کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لیں کہ تخلیقی صحافت،

روزناموں میں نہیں صرف ہفت روزوں میں پروان چڑھتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ بعض ان پڑھ مدیروں کو چھوڑ کر ہفت روزہ صحافت سے وابستہ بہت سے دوست ، میری تنقید اور تجاویز پر سنجیدگی سے غور کر کے ان سے اتفاق یا اختلاف ظاہر کریں گے ، لیکن ویکلی نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس نے میرے اُٹھائے ہوئے نکتوں کا جواب دینے کی بجائے کانفرنس کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کر کے ، میرے بارے میں وہی زبان ، وہی لب ولہجہ اور وہی اندازِ بیان اختیار کیا جو ان میں سے بہت سے مدیرانِ کرام اپنے اخبارات کے اداریوں میں استعمال کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ زبان اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کا کسی مہذب محفل میں حوالہ بھی دیا جائے !

ایڈیٹرس کانفرنس نے ڈیڑھ صفحے کے میرے مضمون کا صرف یہ جواب دیا کہ ''میں بنیادی طور پر شیخ محمد عبداللہ کا دشمن ہوں اور میں نے کسی محفل میں ، جہاں ہفت روزہ ایڈیٹرس کانفرنس کے سبھی ممبران موجود تھے ، شیخ صاحب سے انتقام لینے کی قسم کھائی ہے۔'' میں اس انکشاف کی تائید یا تردید کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہوں ، اس لئے اس کے جواب میں ، میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن مدیرانِ محترم سے ضرور یہ پوچھنا چاہوں گا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے ، اگر وہ حرف بحرف صحیح بھی ہے تب بھی اس کا اصل مسئلے سے کیا تعلق ہے ؟ کیا شیخ عبداللہ کا دشمن ہوتے ہوئے بھی ایک صحافی اچھا صحافی نہیں ہوسکتا ؟ اور اُن کی دوستی اور دشمنی کا صحافت سے براہ راست کیا تعلق ہے ؟ میرے صحافی دوست بُرا نہ مانیں تو میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ انہوں

نے شیخ صاحب کے لئے سُراغ رسانی کا کام کب سے شروع کر دیا ہے؟
کوئی شخص یا صحافی شیخ محمد عبداللہ کے متعلق کیا کہتا ہے، اس کا کھوج لگانا اور
اسے شیخ صاحب تک پہنچانا، یہ سب کچھ ہفتہ واری صحافت کے دائرے میں
کیوں کر آتا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان مُرتب کرتے وقت بھی
مدیرانِ محترم کی نگاہیں محکمۂ اطلاعات کے اشتہارات کی جانب لگی ہوئی تھیں
کہ شاید اس سراغ رسانی کے عوض میں انہیں زیادہ سے زیادہ اشتہارات مل
جائیں! بہر حال مجھے اپنے ہم پیشہ دوستوں کے ذہنی رویے اور ان کی ذہنی
سطح، دونوں سے بڑی مایوسی ہوئی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان کے لئے صحافت
محض روٹی اور روزی کا مسئلہ ہے!

مہندر کول:-

مہندر کول بی بی سی لندن میں پروڈیوسر ہیں اور وہ اس سال ملکہ
برطانیہ کی طرف سے دیئے جانے والے اعزازات کی فہرست میں واحد
ایشیائی ہیں۔ کول صاحب کے اس اعزاز پر یُوں تو سارے ملک کو فخر ہونا
چاہئے لیکن ان کا تعلق چونکہ کشمیر سے ہے، اس لئے کشمیریوں کو فخر اور مسرت
کے اظہار کا کچھ زیادہ ہی حق حاصل ہونا چاہئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا
آغاز ریڈیو کشمیر کے اناؤنسر کی حیثیت سے کیا ہے اور جن لوگوں نے
۱۹۴۸-۴۹ء میں ریڈیو کشمیر کے ایک پروگرام ''جوابی حملہ'' میں ان کی آواز
سنی ہے، وہ آج بھی اس آواز کے سحر کو نہیں بھولیں گے۔ ریڈیو کشمیر سے
مہندر کول، آل انڈیا ریڈیو دہلی میں نیوز ریڈر ہو گئے اور پھر وہاں سے بی بی

سی اور وائس آف امریکہ نے ان کی خدمات مستعار لیں۔ امریکہ میں اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران مہندر نے مغربی دُنیا میں اپنی آواز، اپنے انداز میں اپنی شخصیت کا وہ سکّہ جمایا کہ بی بی سی لندن نے ایک بار پھر انہیں اپنے ہاں کام کرنے کی دعوت دی اور پچھلے دس بارہ سال سے وہ بی بی سی میں پروڈیوسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

مجھے لنڈن میں قیام کے دوران بی بی سی پر مہندر کول کے تیار کردہ پروگرام دیکھنے کا کئی بار موقعہ ملا ہے اور مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ ان کے پروگرام، انگریز پروڈیوسروں کے تیار کردہ پروگراموں کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ اور مقبول ہیں اور خاص طور پر لندن میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی ان کی شخصیت اور پروگراموں کے گرویدہ ہیں! مہندر کول بڑے اچھے دوست اور اس سے بھی زیادہ اچھے میزبان ہیں۔ لندن شہر کے وسط میں ان کے دو ریستوران ہیں اور ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان میں جگہ حاصل کرنے کے لئے کئی دن پہلے ریزرویشن کرنا پڑتی ہے۔ یہ بات ہم سب کے لئے قابل فخر ہے کہ ہمارے ایک بھائی نے ایک غیر ملک میں اپنی قابلیت اور اہلیت کے جھنڈے گاڑ کر ہمیں بھی سر بلندی کا احساس دِلایا ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں مہندر کول کو آپ سب کی طرف سے اس عظیم اعزاز پر دلی مبارکباد پیش کروں!

۷ دسمبر ۱۹۷۳ء

اس گھر کو آگ لگ گئی ....:۔

پارلیمنٹ میں اس وقت تنظیمی کانگریس کے ایک ممبر پرسنا بھائی مہتہ کا ایک پرائیویٹ بل زیر بحث ہے، جس میں آئین ہند سے دفعہ ۳۷۰ کو خارج کر کے ریاست جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے پچھلے پندرہ برسوں کے دوران یہ غالباً چوتھا موقع ہے کہ جب اس قسم کا بل لوک سبھا میں پیش ہوا ہے اور اگرچہ توقع ہے کہ پہلے ہی کی طرح یہ بل بھی ''کثرت رائے'' سے مسترد کر دیا جائے گا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ متعدد بار رد کئے جانے کے باوجود آئین ہند کی اس دفعہ کو منسوخ کرنے کا مطالبہ جاری ہے اور مطالبہ کرنے والوں میں جن سنگھ کے اٹل بہاری باجپائی ہی نہیں، تنظیمی کانگریس کے مرارجی ڈیسائی اور پرسنا بھائی مہتہ جیسے لوگ بھی شامل ہیں مہتہ صاحب میرے دوست ہیں اور وہ وضع قطع سے ہی

نہیں، عادات واطوار کے اعتبار سے بھی شریف آدمی کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ اس لئے مجھے یہ جان کر قدرے تعجب ہوا کہ انہوں نے اس قسم کا بل پیش کیا ہے اور انہیں یہ جان کر کہ میں اس بل کی پرزور مخالفت کرنے والا ہوں، بڑی حیرت ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ اس بل کی حمایت میں سب سے زوردار تقریر میں ہی کروں گا، کیونکہ بقول ان کے ''آئین ہند کی یہ مخصوص دفعہ کشمیری عوام کی گردن میں ایک زنجیر کی حیثیت رکھتی ہے'' بحث میں حصہ لینے کے لئے اپنی تقریر تیار کرنے کے دوران جب مجھے اس بل پر پرانی بحثوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تو پرسنا بھائی مہتہ کی ''حیرت'' اور ''خوش فہمی'' کا پس منظر بھی سمجھ میں آ گیا۔ مجھے یہ جان کر دُکھ ہوا کہ جب جب پارلیمنٹ میں دفعہ ۳۷۰ کو ختم کرنے کا بل پیش ہوا ہے جموں اور کشمیر کے ممبران پارلیمنٹ نے ہمیشہ اس کی پرزور حمایت کی ہے۔ بادشاہ سے زیادہ ان وفادار ''نمائندوں'' نے ریاستی عوام کے جذبات واحساسات اور ان کے وسیع تر مفادات کو نظر انداز کر کے صرف اپنا اعتبار بڑھانے کے لئے دفعہ ۳۷۰ کی فوری منسوخی کا مطالبہ کیا ہے اور اپنی لچھے دار تقریروں سے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ کشمیر کے عوام اپنی اس ''خصوصی حیثیت'' سے سخت نالاں اور پریشان ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں پرکاش ویر شاستری کے پیش کردہ بل پر اسمبلی کے موجودہ اسپیکر خواجہ عبدالغنی گونی، مرحوم سید نذیر حسین سمنانی اور شری شیام لال صراف کی تقریریں پڑھ کر مجھے گھن آنے لگی، کہ ریاستی عوام کی ''نمائندگی'' کا دعویٰ کرنے والے ان ''بزرگوں'' نے کس بے ایمانی اور بے حیائی سے کام

لیا ہے، تینوں حضرات نے جمہوریت ، انصاف ، شرافت ، اخلاق اور انسانیت کی دہائیاں دے دے کر یہ مطالبہ کیا ہے کہ خدارا! دفعہ ۳۷۰ کو ختم کر کے ہمیں اس عذاب سے نجات دو، شری گونی نے جب یہ شکایت کی کہ دفعہ ۳۷۰ کو برقرار رکھ کر ہمارے ساتھ سیکنڈ کلاس شہریوں کا سلوک کیا جارہا ہے تو مرحوم سید نذیر حسین سمنانی نے اس میں یہ ترمیم کی کہ سیکنڈ کلاس نہیں، بلکہ تھرڈ کلاس، شری صراف کا کیا کہنا، انہوں نے تو اپنی غیر مربوط تقریر میں دفعہ ۳۷۰ کی منسوخی کو کشمیر کے سارے دکھوں کا علاج قرار دیا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب کانگریسی ممبر مسٹر کھاڈیل کر (جو اس وقت سپلائی کے وزیر ہیں) نے اس بل کی مخالفت میں ایک بڑی مدلل اور زوردار تقریر کی، تو کشمیر کے ممبرانِ پارلیمنٹ نے ان پر فقرے کسے اور مسٹر چٹرجی نے مسٹر کھاڈیل کر کو یہ طعنہ دیا کہ وہ کشمیری ممبران پارلیمنٹ کے مقابلے میں بھی زیادہ کشمیری بننے کی کوشش کررہے ہیں۔ بحث کے خاتمے پر بل تو نا منظور ہوگیا، لیکن اس وقت کے وزیر داخلہ شری گلزاری لال نندہ نے اپنی جوابی تقریر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ کشمیری ممبران پارلیمنٹ کی ''وطن پرستی'' سے بے حد متاثر ہوگئے ہیں اور انہوں نے ان وطن پرستوں کو یقین دلایا کہ دفعہ ۳۷۰ کو رفتہ رفتہ بے اثر اور بے کار بنا دیا جائے گا۔ اس پس منظر میں ہندوستان میں بہت سے لوگ اگر دیانتداری اور خلوص کے ساتھ دفعہ ۳۷۰ کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہمیں حیرانگی یا غصہ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں ایک بار بھی کسی کشمیری ممبر پارلیمنٹ نے اس سلسلے میں

ریاستی عوام کے جذبات، احساسات، خدشات اور مفادات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا ہے۔ اور وہ پارلیمنٹ ہی کو نہیں سارے ملک کی رائے عامہ کو گمراہ کرتے رہے ہیں آج پہلی بار پارلیمنٹ میں اس بل پر بحث کے دوران کشمیری عوام کی آواز سنائی دی اور پرسنا بھائی مہتہ کی طرح اکثر معزز ممبرانِ پارلیمنٹ کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ کشمیری عوام نہ صرف دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کیے جانے کے خلاف ہیں بلکہ پچھلے پندرہ بیس سالوں کے دوران اس دفعہ کی بے حرمتی اور آبروریزی کرنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے گئے ہیں ان پر اپنے شدید غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ کو یہ بات بتادی جائے گی کہ اُس ایوان کو دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کرنے کا اختیار ہی نہیں ہے۔

اُردو ایڈیٹرس کانفرنس:۔

۱۷، ۱۸، اور ۱۹ نومبر کو لکھنو میں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کا خصوصی اجلاس اس لحاظ سے ایک تاریخی اجتماع تھا کہ اتنی بھاری تعداد میں اُردو اخبارات کے ایڈیٹر کبھی ایک مرکز پر جمع نہیں ہوئے ہیں لیکن کانفرنس شروع ہوتے ہی مدیران کرام کے باہمی اختلافات اور ذاتی مناقشات بھی منظر عام پر آنے لگے اور آخری دن تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید قلم چلانے والوں کے درمیان چاقو چلانے کی بھی نوبت آجائے۔ بزرگوں کی نصیحت اور مداخلت سے یہ خطرہ تو ٹل گیا۔ لیکن کانفرنس کے مستقبل کے متعلق ''اندیشہ ہائے دور دراز'' اب بھی موجود ہیں۔ کانفرنس کے منتظمین اس بات کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے دن رات ایک کر کے اُردو صحافیوں کا اتنا

بڑا مجمع اکٹھا کیا۔ اور اگر مجمع اکٹھا کرنا ہی بجائے خود مقصد تھا تو پھر اس مقصد میں انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے، لیکن اگر اس کے علاوہ بھی اس اجتماع کا کوئی مقصد اور اس کانفرنس کی کوئی منزل تھی تو میرے لئے اس کا اندازہ یا یقین کرنا مشکل ہے۔ تین روز تک یہ کانفرنس جس طرز پر چلتی رہی، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پروگرام، ایجنڈے اور مقاصد پر کوئی توجہ صرف نہیں ہوئی ہے اور خود منتظمین کو آخری وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دُور دراز سے آئے ہوئے سینکڑوں مندوبین ذہنی انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ انگریزی روزنامہ ''اسٹیٹسمین'' کے مدیر شری کلدیپ نیّر آخری وقت تک کانفرنس کو بچانے کی تگ و دو کرتے رہے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوگئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ عربوں اور اسرائیلیوں کے معاہدۂ صلح کی طرح مدیران کرام کی جنگ بندی بھی عارضی ہے اور اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ اس کشمکش میں شری کلدیپ نیّر کی عزت و عصمت بھی خطرے میں پڑ جائے کیونکہ کانفرنس کے دوران ہی کچھ مدیران کرام کو یک لخت یہ بات بھی یاد آگئی کہ ''اسٹیٹسمین'' عربوں اور اسرائیلیوں کی جنگِ بندی میں اسرائیلیوں کا طرفدار ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انکشاف کرنے والے ایک ایسے صحافی تھے کہ جو ایک دن قبل انہیں اُردو اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دوست اور محسن مانتے تھے۔ اُردو ایڈیٹرس کی اس سہ روزہ کانفرنس سے وزیراعظم شری اندر کمار گجرال، شری بہوگنا وزیراعلیٰ یوپی، شیخ محمد عبداللہ،

سوتنتر پارٹی کے مسٹر پیلو مودی، کمیونسٹ پارٹی کے مسٹر اسحٰق سنبھلی، اور اس خاکسار نے بھی خطاب فرمایا۔ لیکن کانفرنس کا حاصل مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا خطبۂ استقبالیہ اور مولانا عثمان فارقلیط کا خطبۂ صدارت تھا۔ عبدالماجد دریا آبادی کی عمر اسی ۸۰ برس کے قریب ہوگی اور وہ اب بہت ضعیف ہوگئے ہیں انہوں نے لکھنو کی مخصوص زبان اور محاورے میں مہمانوں کا استقبال کیا اور مسز گاندھی کو وزیر اعظم کی بجائے موتی لعل نہرو کی پوتی اور جواہر لعل نہرو کی بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔ مولانا کا اسٹیج پر آکر وزیر اعظم کا خیر مقدم کرنا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اور جو لوگ ان کے ماضی اور ان کے حال سے واقف ہیں انہیں ان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ کہ مسز گاندھی، اندر کمار گجرال اور شری بہوگنا نے پہلی مرتبہ ہی ان کا نام سنا۔ اس لئے وہ اس اجتماع میں اس ''بڈھے'' کی معنویت اور اہمیت کو سمجھ نہیں پائے۔ مولانا عثمان فارقلیط کا خطبۂ صدارت اپنی سادگی، صداقت اور جوش کے اعتبار سے ایک ایسا نادر اور بیش قیمت تحفہ تھا کہ اس پر اُردو ہی نہیں ہر زبان کے صحافی فخر کرسکتے ہیں۔ مولانا نے پندرہ منٹ کے اپنے خطبے میں اپنی پچاسی سالہ زندگی اور پچاس سالہ صحافتی تجربے کا نچوڑ پیش کیا تھا۔ اور ایسی سلیس اور موثر زبان میں کہ ہر ہر فقرے پر واہ واہ کے نعرے بلند ہوئے۔ مولانا کے خطبۂ صدارت کو اس کانفرنس کا حاصل کہیں تو بجا ہوگا۔ شیخ صاحب نے جب اُردو صحافت کے مسائل پر اپنا لکھا ہوا مقالہ پڑھ کر سنایا تو سارے پنڈال میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ کانفرنس شروع ہوتے ہی لوگوں کو

ان کی آمد کا انتظار تھا اور بہت سے لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ صرف انہیں دیکھنے اور سننے کے لئے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے تقریر کرنے کی بجائے اپنا تحریری مقالہ پڑھ کر انہیں مایوس کردیا۔ شیخ صاحب اس سے پہلے بھی سرینگر میں اقبال نمائش کے موقع پر یہ حرکت کر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ انہیں یہ روش ترک کردینا چاہیئے۔ وہ ایک اچھے مقرر ہیں اور ان کی تقریر، ان کی تحریر سے یقیناً زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

بعض مخالف پارٹیوں نے کانفرنس پر یہ الزام عائد کیا کہ یہ اُتر پردیش میں ہونے والے انتخابات کے موقع پر سرکاری ایماء سے منعقد ہو رہی ہے اور اس کا مقصد اُردو کو مراعات دے کر یوپی کے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنا ہے۔ اپنی تقریر میں اس الزام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انتخابات میں لوگوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے عام طور پر حکومت اس قسم کی مراعات دیتی ہے۔ اور اُردو زبان کو بھی اگر انتخابات کے بہانے کچھ مراعات حاصل ہوتی ہیں تو ہمیں ان کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں، میں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ میرے شوپیان سے ریاستی اسمبلی کے لئے ۱۹۶۷ء میں انتخابات لڑتے وقت میں مخالف حکمراں جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک گاؤں کے لوگوں نے میرے مخالف سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ان کو بجلی مہیا کردے تو وہ اس کے حق میں ووٹ دیں گے۔ حکمران جماعت کے اُمیدوار نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے راتوں رات بجلی کے کھمبے اس گاؤں میں پہنچا کر لوگوں کو یقین دلایا کہ انتخاب میں کامیابی

کے فوراً بعد اس گاؤں کو بجلی مہیا ہوگی۔ گاؤں والوں نے اس کے باوجود میرے حق میں ووٹ دیئے اور کچھ دنوں بعد جب سرکاری اہلکار بجلی کے کھمبے واپس اُٹھانے لگے تو دیہاتوں نے ان کا گھیراؤ کر کے انہیں کھمبے اُٹھانے سے روک دیا، نتیجہ یہ کہ کھمبے وہیں رہ گئے اور پھر چند ماہ بعد چار و نا چار حکومت کو بجلی مہیا کرنا ہی پڑی۔ مطلب یہ کہ اگر انتخابات کے بہانے اُردو کے لئے کچھ کھمبے نصب کر دیئے جائیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

موڈاسا کی تباہ کاریاں:-

اکتوبر کی ۹ تاریخ کو احمد آباد سے ساٹھ میل کے فاصلے پر موڈاسا نامی قصبے میں فرقہ وارانہ آگ بھڑک اُٹھی اور سینکڑوں لوگ بے گھر ہوگئے، فسادیوں نے چن چن کر مسلمانوں کے مکانات کو آگ لگا کر ان کی دکانیں لوٹ لیں، چار گھنٹوں کی تاخیر کے بعد جب احمد آباد سے اسٹیٹ ریزرو پولیس کے دستے پہنچ گئے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ فسادی جہاں بھی نظر آئیں انہیں گولی ماردی جائے اس طرح لوٹ مار اور آتش زنی کا سلسلہ ختم ہوگیا لیکن بعد از خرابی بسیار، موڈاسا میں امن ہوگیا، لیکن فرقہ وارانہ منافرت کی چنگاریاں اُڈ اُڈ کر دور دیہات تک پہنچ گئیں جہاں غریبوں کے ایک ایک دو دو گھر جلائے گئے یا لوٹے گئے۔ اب اس علاقے میں بظاہر امن ہے۔ لیکن مسلمانوں میں خوف و ہراس اور دہشت باقی ہے۔ اور گجرات مسلم مجلس مشاورت کے اراکین کا اصرار تھا کہ شیخ صاحب علاقے کا دورہ کر کے مسلمانوں میں اطمینان اور اعتماد بحال کرنے کی کوشش کریں۔

۲۱ر نومبر کو اراکین مجلس کی دعوت پر شیخ صاحب اور میں احمد آباد پہنچے تو ہمارے ساتھ جہاز میں سوتنتر پارٹی کے چیرمین مسٹر پیلو مودی بھی سفر کر رہے تھے۔ ان سے دورانِ گفتگو یہ معلوم ہوا کہ موڈاسا کا قصبہ سابر کانٹھا کے اس پارلیمانی حلقۂ انتخاب کا ایک حصہ ہے کہ جہاں ۹ دسمبر کو سی ڈیسائی کی موت سے خالی ہونے والی نشست کے لئے ضمنی انتخابات ہو رہے ہیں۔ احمد آباد میں احباب کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ ہمارے موڈاسا کے دورے کو سیاسی حلقوں میں غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے۔ اور اخبارات کی رائے میں شیخ صاحب دراصل سابر کانٹھا کے انتخاب میں کانگریس کی حمایت کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ سرکٹ ہاؤس پہنچنے کے فوراً بعد اخباری نمائندے وارد ہوگئے اور ہماری آمد کی ''اصل'' پوچھنے لگے۔

دوسرے دن ہم اپنے گجراتی میز بانوں کے ہمراہ علی الصبح موڈاسا کے لئے روانہ ہوگئے جہاں ہم نے اپنی آنکھوں سے فسادات کی تباہ کاریاں دیکھیں۔ فساد کی وہی وجہ تھی، جو عام طور پر اس قسم کے فسادات کا بہانہ ہوا کرتی ہے۔ دو آدی باسی لڑکیاں رات کو سنیما دیکھ کر جب گھر جارہی تھیں تو دو نوجوانوں نے انہیں چھیڑا اور چھیڑنے والے نوجوانوں کے نام بدقسمتی سے اسلامی تھے۔ بس اس جرم پر موڈاسا کے سارے مسلمان ملزم قرار پائے اور غنڈوں نے ان کے گھر بار لوٹ لئے۔ ایک نوجوان لڑکا فائرنگ سے ہلاک ہوگیا۔ شیخ صاحب کی آمد کی خبر سنتے ہی سارا موڈاسا سڑکوں پر آگیا۔ انہیں ایک کھلی جیپ میں بٹھا کر قصبے کے بڑے بازار سے امن کمیٹی کے

دفتر پر لے جایا گیا۔ جہاں ان کی خدمت میں ایک استقبالیہ ایڈریس پیش کیا گیا۔ استقبالیہ کے جواب میں شیخ صاحب نے اپنے گجراتی سامعین کو مہاتما گاندھی کی یاد دلائی اور کہا کہ ''مجھے اس بات کا بے حد دُکھ ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں پچھلے چند سالوں کے دوران گجرات کو ملک گیر ہی نہیں، عالمگیر شہرت حاصل ہو رہی ہے۔ حالانکہ جس زمین پر گاندھی جی جیسے مہا پرش نے جنم لیا ہو، وہ اس قسم کے زہر سے پاک ہونا چاہئے تھی۔ گوڈسے نے گاندھی کو صرف ایک بار مارا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کی سر زمین پر وہ بار بار قتل ہوتے رہیں گے۔''

شیخ صاحب نے کہا کہ اس مایوس کن اور حوصلہ شکن ماحول کا تقاضا یہ ہے کہ ہر گجراتی ایک دن کے لئے برت رکھ کر اپنے من کو جھنجھوڑ دے تا کہ اس کی انسانیت اور اُس کی آتما بیدار ہو جائے، انہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی کہ وہ مایوسی اور فرار کا راستہ ترک کر کے ایک بار پھر ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنی تباہ شدہ زندگی کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ یہاں سے ہم موڈاسا کی جامع مسجد میں گئے جہاں کچھ نوجوانوں نے اصرار کیا کہ میں بھی تقریر کروں۔ میں فساد کی تباہ کاریوں سے بے حد متاثر ہوا تھا، اس لئے میں نے ایک بہت ہی جذباتی تقریر کر ڈالی۔ میں نے کیا کہا، مجھے اچھی طرح یاد نہیں آرہا ہے۔ نماز کے بعد شیخ صاحب نے ایک گھنٹے کی تقریر میں مسلمانوں کی ہمت بندھائی شام کو احمد آباد میں وزیر اعلیٰ چمنی بھائی پٹیل سے ملاقات ہوئی اور شیخ صاحب نے انہیں تفصیل کے ساتھ موڈاسا کی تباہ کاریوں اور وہاں

کے مسلمانوں کو درپیش مسائل سے آگاہ کیا۔ وزیر اعلیٰ نے یقین دلایا کہ تباہ ہونے والوں کی آبادکاری کی طرف پوری توجہ دی جائے گی۔ اور بغیر سود کے قرضہ تقسیم کرنے کی ہدایات جاری ہوئی ہیں۔

رات کو شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں پبلک جلسے کا اہتمام تھا۔ جہاں پچیس ہزار سے بھی زیادہ لوگ شیخ صاحب کی تقریر سننے کے لئے جمع تھے۔ ابتداء میں، میں نے اپنی تقریر میں اخبار نویسوں اور نام نہاد صحافیوں کو آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ کس طرح غلط خبریں پھیلا کر شر اور فساد پھیلاتے ہیں، میں نے لوگوں سے کہا کہ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کا پچاس فیصد حصہ غلط اور بے بنیاد ہوتا ہے اور اس سلسلے میں گجرات کے اخبارات نے ملک کے دوسرے اخبارات پر سبقت حاصل کی ہے۔ میں تقریر کر رہا تھا تو مجمع میں سے کچھ نوجوانوں نے شیخ صاحب تک کاغذ کے دو چار پُرزے پہنچا دیئے۔ شیخ صاحب انہیں پڑھ کر مسکراتے رہے اور میری تقریر کے بعد جب انہوں نے اپنی تقریر شروع کی تو معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ شیخ صاحب اپنی تقریر میں ان کا جواب دیں...... ان ''اشتعال انگیز'' سوالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ صاحب نے ایک ایسی عمدہ، برجستہ، جوشیلی اور مدلل تقریر کی کہ میں نے آج تک ان کی زبانی ایسی شاندار تقریر نہیں سنی ہے۔ انہوں نے بڑی وضاحت اور قدرے تفصیل کے ساتھ مسئلہ کشمیر کی ابتداء، اس کی تاریخ اور اس کی پیچیدگیاں بیان کیں۔ پھر بڑے مدلل انداز میں اپنا موقف بیان

کر کے اپنے نکتہ چینوں کو مسکت جواب دیئے۔ اور آخر میں بڑے ہی پُر جوش انداز میں اپنے مخالفوں کو للکار کر کہا کہ "شیخ محمد عبداللہ کو لیڈری کی ہوس نہیں ہے۔ وہ چالیس سال سے اپنے سر پر کانٹوں کا یہ تاج اُٹھائے ہوئے ہے۔ لیکن وہ مسلمانوں کے زخموں کی تجارت اور سودا بازی کرنے والوں کو خبردار کرنا چاہتا ہے کہ انہیں مظلوم اور بے بس مسلمانوں کے جذبات سے کھیل کر اپنا الوسیدھا کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔" شیخ صاحب پورے دو گھنٹے تک بولتے رہے۔ لیکن مجال ہے کہ مجمع میں سے ایک بھی آدمی نے اپنا سر ہلایا ہو۔ بلا مبالغہ یہ ان کی بہترین تقریر تھی۔ اور رات کے ساڑھے بارہ بجے جب جلسہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا تو فضاء شیر کشمیر زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔

دوسرے دن ہمیں علی الصبح ہوائی جہاز سے دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا لیکن معلوم ہوا کہ تمام ہوائی سروسیں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ اس لئے ناچار ریل کی مسافت اُٹھانی پڑی۔ اور پورے چوبیس گھنٹے کے بعد ہم ۲۵ نومبر کو دہلی پہنچ گئے۔

سیٹھ گووند داس کو "شردھانجلی":۔

پچھلے ماہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبروں نے پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں سیٹھ گووند داس ممبر پارلیمنٹ کو اپنی پارلیمانی زندگی کے پچاس سال مکمل کرنے پر مبارکباد دینے کیلئے ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ سیٹھ صاحب ۱۹۲۳ء میں سنٹرل (Legislatura) میں جبل پور سے منتخب ہوئے تھے اور

اس کے بعد سے آج تک وہ برابر اسی حلقۂ انتخاب سے مسلسل منتخب ہو رہے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر بار انھیں پہلے سے زیادہ اکثریت ملتی رہی۔ تقریب کی صدارت لوک سبھا کے اسپیکر نے کی۔ اور سیٹھ صاحب کو بدھائی دینے والوں میں وزیر اعظم کے علاوہ تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈر بھی شامل تھے۔ جب سبھی پارٹی لیڈر مبارک باد کا فریضہ انجام دینے سے فارغ ہو گئے تو اسپیکر نے اعلان کیا کہ اب پارلیمنٹ میں ''شمیم گروپ کے لیڈر'' سیٹھ صاحب کو خراج عقیدت پیش کریں گے، اس پر بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ اور اس کے بعد میں نے ایک مختصر سی تقریر میں ان الفاظ میں سیٹھ صاحب کو پارلیمانی زندگی کے پچاس سال مکمل کرنے پر مبارک باد دی۔

''سیٹھ صاحب نے پارلیمنٹ میں سب سے زیادہ وقت گزارا ہے اور میں نے سب سے کم، اس لئے انہیں مبارکباد دینے کا سب سے زیادہ حق دار میں ہی ہوں۔ ابھی اٹل بہاری باجپائی نے سیٹھ صاحب کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ سیٹھ گوند داس نے کئی بار اپنی جماعت کے وہپ کی پروا کیے بغیر اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دیا ہے۔ یہ اگر کوئی بڑی بات ہے تو مجھے بھی اس کے لئے مبارکباد ملنا چاہئے۔ کیونکہ جو کام سیٹھ صاحب نے ایک یا دو بار کیا ہے وہ میں تقریباً ہر روز کرتا ہوں۔ اور پارلیمنٹ میں ہر معاملے پر کسی وہپ کی بجائے اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دیتا ہوں کیا ہی اچھا ہوتا کہ باجپائی جی بھی کبھی کبھی وہپ کی بجائے اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دیتے بلکہ سب لوگ یہی کریں تو اس ملک کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

سیٹھ گووند داس کی مہان شخصیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہے کہ وہ پچاس سال سے ایک ہی حلقۂ انتخاب سے منتخب ہو کر آرہے ہیں۔ سیٹھ صاحب تو مہان ہیں ہی لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ بھی کم مہان نہیں ہوں گے، جو انہیں بار بار پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں۔ بڑے سادہ، بڑے شریف، بڑے نیک اور بڑا بھروسہ کرنے والے لوگ ہوں گے اور میں انہیں ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایک میں ہوں کہ ایک انتخاب کے بعد پھر کبھی اس حلقۂ انتخاب کا رُخ نہیں کرتا۔ اور دوسرا انتخاب لڑنے کے لئے کسی ایسی کانسٹی چیونسی کا انتخاب کرتا ہوں کہ جو پہلی کانسٹی چیونسی سے کم از کم پچاس میل دور ہو، تاکہ ان کو میرے سابقہ کارناموں کا علم نہ ہو سکے اور جو بات میرے حق میں صحیح ہے وہ دوسرے ممبران پر بھی صادق آتی ہے۔ دوسری طرف سیٹھ گووند داس ہیں کہ ایک ہی حلقۂ انتخاب سے چُنے جارہے ہیں۔ میں سیٹھ صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ جب بھی ریٹائر ہونا چاہیں مجھے جبل پور حلقۂ انتخاب میں اپنا جانشیں نامزد کریں۔ تاکہ میں بھی کم از کم پچاس سال کے لئے مطمئن ہو کر قوم کی خدمت کروں۔ کیونکہ پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے قوم کی جو خدمت ہو سکتی ہے وہ کسی دوسری طرح ممکن نہیں۔ یہاں حکومت کی مخالفت کرو، تب بھی پیسہ ملتا ہے۔ حکومت کی حمایت کرو تب بھی، کچھ نہ کرو تب بھی۔ اور ظاہر ہے کہ قوم کی خدمت کا اس سے بہتر کوئی طریقہ تو نہیں۔''

''آخر میں، میں سیٹھ گووند داس کی خدمت میں اپنی ''شردھانجلی''

پیش کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ بھگوان انہیں ابھی بہت دنوں تک زندہ رکھے۔'' شردھانجلی کا لفظ سنتے ہی ہال میں بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ غالباً میری ہندی مجھے دھوکا دے گئی ہے۔ ''شردھانجلی'' کا لفظ تو سورگباشیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تقریب کے اختتام پر سبھی لوگوں نے مجھے مبارک باد دی کہ میری تقریر اس شام کی سب سے اچھی اور خوبصورت تقریر تھی۔ مبارک باد دینے والوں میں وزیر اعظم کے علاوہ سیٹھ گووند داس بھی شامل تھے۔ کہ جنہوں نے غالباً شردھانجلی کا لفظ سنا ہی نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اونچا سنتے ہیں۔ شکر ہے کہ وہ اونچا سنتے ہیں۔ ورنہ پارلیمنٹ میں پچاس سال گزارنے والے کو تو بہرا ہونا چاہیے تھا۔

''سرینگر ٹائمز'' پر حملہ :-

میں لکھنو میں اُردو ایڈیٹرس کانفرنس میں شرکت کے بعد دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ سرینگر سے شائع ہونے والے روزنامے ''سرینگر ٹائمز'' کے دفتر پر ڈرائیوروں کی ایک ٹولی نے حملہ کر کے اسے زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ اس بدتمیزی اور بداخلاقی کی وجہ ''سرینگر ٹائمز'' میں شائع شدہ ایک کارٹون تھا کہ جس سے پرائیویٹ ٹرانسپورٹروں کی بے رحمی اور سنگدلی ظاہر ہوتی تھی۔ کسی بھی شخص کی آزادیٔ رائے، اس کی تحریر یا تقریر پر کسی قسم کی پابندی عائد کی جائے تو آزادی، جمہوریت اور انصاف پر اعتماد رکھنے والوں کو اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے۔ لیکن اخبارات کے

خلاف اس قسم کی تشدد آمیز کاروائیاں کرنے والوں کی پُر زور مذمت کی جانا چاہیے اور مجھے خوشی ہے کہ ہماری سیاسی اور سماجی زندگی سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگوں نے اس مذموم کاروائی کے خلاف اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ اخبارات میں شائع شدہ ہر خبر یا کارٹون سے کسی نہ کسی مفاد خصوصی پر زد پڑنا ناگزیر ہے۔ اور اگر ہر شخص قانون ہاتھ میں لے کر اپنی ناراضگی یا اپنے ردعمل کا اظہار اسی طریقے پر کرے کہ جس طرح ہمارے ڈرائیور دوستوں نے کیا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ وہ گاڑیاں چلانے کے ساتھ ساتھ اس ملک کے اخبارات چلانے کا کام بھی اپنے ہی ہاتھ میں لیں۔ ''سرینگر ٹائمز'' پر حملہ ایک اخبار نہیں اس ریاست کی آزادئ تحریر و تقریر پر حملہ ہے۔ اور میں حملہ آوروں کی اس مذموم حرکت کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہوں ہم اخبار نویس لوگ ہر روز کسی نہ کسی کا دل دُکھانے پر مجبور ہیں۔ ہمیں طاقت اور تشدد کے ذریعے حق بات کہنے سے روکنے کی کوشش کرنا، اخلاق، شرافت، آزادی اور انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے اس لئے تمام اخبار نویسوں کو اس قسم کی غنڈہ گردی کے خلاف منظّم ہو جانا چاہئے اربابِ حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس ریاست کے صحافیوں کو اظہارِ خیال کی مکمل آزادی دینے اور اس کا تحفظ کرنے میں اپنے فرائض پورے کریں۔

حکومت اور اپوزیشن:۔

پارلیمنٹ کے رواں اجلاس کے دوران حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے اب کی بار میں نے حق بات کہہ کر

حکومت اور اپوزیشن دونوں ہی کو ناراض کر دیا۔ میں نے اپنی پندرہ منٹ کی تقریر میں ۷ منٹ تو حکومت کی ''مرمت'' پر صرف کئے۔ اور ۸ منٹ اپوزیشن کی ''مزاج پرسی'' میں۔ نتیجہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے الفاظ میں ۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اپنی تقریر کا خلاصہ قارئین ''آئینہ'' کی خدمت میں پیش کر کے ان کا ردعمل جاننا چاہوں گا۔ میں نے کہا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ حکومت ہر محاذ پر ناکام ہو چکی ہے اور اس نے ملک کو ایک خطرناک بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں کی نہ رکنے والی رو، اشیائے ضروری کی نایابی، عوامی جذبات اور مطالبات کے تئیں ارباب اختیار کی مجرمانہ سرد مہری، یہ سب ایسے حقائق ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرنے میں، میں اس ایوان کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہوں گا۔ لیکن ایک حقیقت کی طرف اشارہ کئے بغیر چارہ نہیں اور وہ یہ کہ موجودہ حکومت نے کرپشن، رشوت خوری، بے ایمانی اور کنبہ پروری کے پرانے ریکارڈ توڑ کر نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ اور یہ سارا نظام اوپر سے نیچے تک اس درجہ سڑ گیا ہے کہ اب اس سے بدبو آنے لگی ہے مسز گاندھی کو بلاشبہ ۱۹۷۱ء میں اس ملک کے عوام نے بڑی اُمیدوں کے ساتھ اپنا اعتماد بخشا تھا۔ لیکن یہی عوام محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ انہیں دغا دی گئی ہے اور وہ بے حد غصے میں ہیں۔ ملک میں اس وقت جو بے چینی اور غصہ ہے اس کے پیش نظر اس حکومت کو ایک دن کے

لئے بھی اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اور عدم اعتماد کی اس تحریک کا مقصد غالباً حکومت کو اس حقیقت کا احساس دلانا ہے۔لیکن حزب مخالف کے معزز ممبران مجھے معاف کریں گے کہ اس تحریک کا مقصد موجودہ حکومت کی چھٹی کر کے ایک نئی حکومت قائم کرنا بھی ہے۔ورنہ عدم اعتماد کی یہ تحریک محض ایک ڈرامہ بن کر رہ جائے گی۔اور میں پارلیمنٹ کے معزز اور مقدس ایوان میں ڈراما کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں پچھلے کئی سال سے ملک میں اپوزیشن کے رول پر نظر کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک کی ساری اپوزیشن پارٹیاں مسز گاندھی کو اقتدار میں رکھنے کی سازش میں شریک ہیں۔

اپوزیشن پارٹیوں کی موجودہ افراتفری، ان کا باہمی انتشار اور افتراق، ان کی منفی سیاست، یہ سب کچھ مسز گاندھی کو کمزور کرنے کے بجائے انہیں اور ان کی جماعت کو بالواسطہ طور پر قوت عطا کرتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہم مسز گاندھی سے تنگ آ گئے ہیں اور ہم ان سے چھٹکارا چاہتے ہیں لیکن ان کی جگہ ہم کس کو منتخب کریں۔اپوزیشن کے پاس کون سا ایسا متبادل نظام یا پروگرام ہے کہ ہم مسز گاندھی کو دھتکار کر انہیں گلے لگا لیں۔ٹھیک ہے کہ اس جانب نصف درجن سے زیادہ جماعتوں کے نمائندے بیٹھے ہوئے ہیں۔لیکن ان میں سے کس جماعت یا لیڈر میں موجودہ حکومت کو برخاست کر کے اس کی جگہ لینے کا حوصلہ ہے۔جن سنگھ کے اٹل بہاری باجپائی یا سوتنتر پارٹی کے مسٹر پیلو مودی؟ آپ اس ملک کے عوام کو ہنسا ہنسا کر مار ڈالنا چاہتے ہیں۔تو پھر

میرے دوست پیلو مودی کا نام اچھا رہے گا۔ اور اگر آپ انہیں رُلا رُلا کر جاں بحق کرنا چاہتے ہیں تو پھر باجپائی جی کا نام موزوں رہے گا لیکن یاد رکھئے کہ اس ملک کی جنتا لچھے دار تقریروں سے نہیں، ایک قابلِ عمل متبادل نظام اور پروگرام سے ہی موجودہ نظام میں تبدیلی پر آمادہ ہوگی۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مسز گاندھی کی حکومت کی طرح اس ملک کی اپوزیشن نے بھی اس ملک کے عوام کے ساتھ دغا کی ہے، انہیں فریب دیا ہے، اور ان کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اپوزیشن میں بیٹھی ہوئی نصف درجن سے زیادہ جماعتیں جب تک کسی کم سے کم، پروگرام پر متفق نہ ہو جائیں انہیں عوام کا اعتماد اور اعتبار حاصل نہیں ہوگا۔ اور وہ مسز گاندھی کو موجودہ منصب سے ہٹا نہیں سکتے۔ اس لئے میرے دوست جیوتر موئے باسو کو یہ طے کرنا ہوگا کہ ان کے اور اٹل بہاری باجپائی کے درمیان کون سی قدر مشترک ہے۔ ان کے اور سوتنتر پارٹی کے درمیان کس بنیاد پر اتفاق ہوسکتا ہے اور تنظیمی کانگریس میں شری کامراج کی آواز معتبر ہے یا مراجی ڈیسائی کی؟ اسی طرح سوشلسٹ پارٹی میں میرے دوست مدھو لیمائے قابل اعتبار ہیں یا شری راج نارائن؟ جب تک وہ یہ طے نہ کر پائیں، مسز گاندھی کی حکومت قائم رہے گی، حالانکہ اس ملک کے عوام کے لئے اس حکومت کا بوجھ اب ایک دن کے لئے بھی ناقابل برداشت بن گیا ہے اور ان کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں۔"

۷ فروری ۱۹۷۰ء

دہلی سے سرینگر تک کا سفر:-

پچھلے ہفتے دہلی میں، اپنے تین روزہ قیام کے دوران مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ دہلی اور سرینگر کے درمیان فاصلہ کم ہونے کی بجائے بڑھتا رہا ہے۔ کیراول ہوائی سروس کی وجہ سے اگر چہ دہلی سے سرینگر تک کا سفر صرف ۷۰ منٹ میں طے ہو جاتا ہے، لیکن پالم کے ہوائی اڈے پر اُترتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے، کہ ہم ایک بالکل مختلف دنیا میں قدم رکھ رہے ہیں، حالانکہ اب کی بار دلی اور سرینگر کے موسم میں زیادہ فرق نہیں ہے بات دراصل یہ ہے کہ دلی اور سرینگر کی سیاسی آب وہوا میں اتنا نمایاں اورواضح فرق ہے کہ اس فرق کو محسوس کرنے کے لئے غیر معمولی سیاسی بصیرت اور قیافہ شناسی کی ضرورت نہیں۔ انتخابات کی چھل پہل اور سیاسی سرگرمیوں کی حرارت نے اس فرق کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی ملک کے دو حصے ہونے کے باوجود دلی اور سرینگر میں کوئی قدر مشترک نہیں! دلی شہر میں داخل ہوتے ہی انتخابی بخار کا احساس ہونے

لگتا ہے۔ درودیوار پر اشتہارات کی بھرمار، میدانوں میں تقریروں کی گرم بازاری، اخبارات میں چیلنج بازی، دفاتر کے سامنے مظاہرے، سڑکوں پر نعرے، جلسوں میں ہنگامہ آرائی اور جلوسوں میں ہاتھاپائی۔ غرض ایک شورِ محشر بپا ہے اور اس شور شرابے میں یہ سنائی نہیں دیتا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ دلی میں اصل مقابلہ جن سنگھ اور حکمران کانگریس کے درمیان ہے اور دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اپنا سارا زور صرف کر رہی ہیں۔ ۳۱ جنوری کو وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے رام لیلا گراؤنڈ میں اپنی جماعت کی انتخابی مہم کا افتتاح کیا۔ تقریباً اڑھائی لاکھ کا مجمع تھا۔ ایک ہفتہ قبل اسی میدان میں جن سنگھ کے اٹل بہاری باجپائی نے اپنی جماعت کی انتخابی مہم کا آغاز کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کے جلسے میں بھی لاکھ ڈیڑھ لاکھ لوگ موجود تھے ۔ دلی میں کچھ کشمیری تاجروں سے بھی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں تحریر و تقریر کی کس درجہ آزادی ہے وہ ابھی تک یہ ''معمہ'' حل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تھے، کہ اُتر پردیش کے وزیراعلیٰ نے وزیراعلیٰ ہونے کے باوجود ضمنی انتخاب میں شکست کیوں کھائی؟ وہ اس بات پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ دلی کے درودیوار پر ہر روز وزیراعظم کے خلاف نئے نئے اشتہار چھپتے رہتے ہیں اور پولیس کچھ نہیں کہتی۔ ایک بھائی نے جن سنگھ کے ایم ایل اے سوندھی کو کناٹ پلیس میں مسز گاندھی کو بُرا بھلا کہتے ہوئے سنا تھا اور وہ دانتوں میں انگلی دبائے توبہ، توبہ کر رہے تھے، کہ اس ملک میں اندرا گاندھی کی حکومت

ہے، یا جن سنگھ کی۔ پھر ۳۱ جنوری کو رام لیلا گراونڈ میں شریمتی گاندھی نے جن سنگھ کو صلواتیں سنائیں۔ تو میرے کشمیری بھائیوں کو یہ اندازہ ہوا کہ

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

کشمیر سے بھی پارلیمنٹ کی تین نشستوں کے لئے انتخابات ہونے والے ہیں۔ لیکن یہاں کے انتخابات کی ریت ہی دوسری ہے۔ یہاں ووٹ ڈالنے سے پہلے ہی نتائج کا اعلان ہوتا ہے۔ یہاں جلسوں، جلوسوں، پوسٹروں، تقریروں اور دوسری انتخابی سرگرمیوں کی ''ضرورت'' نہیں۔ یہاں وہی ہوتا ہے، جو حکمران جماعت چاہتی ہے اور جب حکمران جماعت کو اپنی ''چاہت'' پوری کرنے میں کچھ مشکلات کا احساس ہوتا ہے، تو وہ اپنی راہ کے تمام کانٹوں کو جلاوطن، گرفتار، اور بے اختیار کر دیتی ہے۔ اب کی بار انتخابی دنگل شروع ہونے سے پہلے ہی تمام پہلوانوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے ہیں۔ اور اب حکمران جماعت کے لاڈلے، سرکاری گاڑیوں میں بلاخوف وخطر، انتخابی جنگ لڑنے نکلے ہیں۔ کشمیر کے تینوں اضلاع میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے اور مخالف اُمیدواروں کو نہ جلسے کی اجازت نہ جلوس کی۔ کانگریسی اُمیدوار کھل کر کہتے ہیں کہ ہم کو ووٹوں کی کیا ضرورت ہے، ہم تو ووٹوں کے بغیر بھی کامیاب ہو سکتے ہیں ووٹوں کے بغیر آدمی کیسے کامیاب ہوتا ہے؟ یہ ہندوستان کے کسی حصے میں کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ لیکن کشمیر میں چونکہ اکثر لوگ اکثر بار ووٹوں کے بغیر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں اس لئے یہ بات سب کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس سے آپ کو یہ اندازہ ہوا

ہوگا، کہ کشمیر اور دلی کے درمیان صرف ستر منٹ کا نہیں ستر سال کا فاصلہ ہے!

دلی میں اپنے قیام کے دوران میں شیخ صاحب اور بیگ صاحب سے بھی ملا۔ شیخ صاحب سے کوٹلہ لین میں واقع اُسی تین نمبر کی کوٹھی میں ملاقات ہوئی، کہ جہاں دو سال قبل ان کی نظر بندی کے دوران ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کافی بشاش اور مطمئن نظر آرہے تھے۔ کشمیر کی موجودہ سیاسی صورت حال پر بہت دیر تک ان سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ شیخ صاحب کے خیال میں، کشمیری عوام کو اپنے جمہوری حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھنا چاہئے۔ انہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ ظلم اور ناانصافی کے موجودہ اندھیرے سے ایک روشن صبح نمودار ہوگی۔ روانہ ہونے سے قبل، میں نے شیخ صاحب سے کہا، کہ ''میں اننت ناگ سے پارلیمانی نشست کیلئے انتخاب لڑ رہا ہوں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟''

''میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' شیخ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مرزا محمد افضل بیگ چانکیہ پوری میں مس مردولا سارا بھائی کے ہاں قیام فرما ہیں۔ حکومت نے انہیں اپنے لئے بہت بڑا خطرہ تصور کر کے جلاوطن تو کر دیا ہے، لیکن ان کے رہن سہن کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ اور اس طرح وہ دلی میں تقریباً بے سروسامانی کی حالت میں دن گذار رہے ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ شیخ صاحب ہی کی طرح ان کی گاڑی کے پیچھے بھی خفیہ پولیس کی ایک گاڑی تعینات ہے۔ شیخ صاحب نے مجھے بتایا، کہ دلی

میں جب وہ کبھی راستہ کھو جاتے ہیں، تو وہ انہی خفیہ پولیس والوں سے راستے کا اتہ پتہ پوچھتے ہیں۔ مجھے بیگ صاحب کے ساتھ گاڑی میں سوار دیکھ کر بچارے پولیس والے یہ جاننے کے لئے پریشان تھے، کہ میں کون ہوں اور کہاں سے نازل ہوا ہوں؟ ان کی مشکل حل کرنے کے لئے پھر میں نے انہیں اپنا کارڈ دیا۔ اورانہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ شیخ صاحب کی قیام گاہ کے باہر بھی مستقل طور پر خفیہ پولیس کے آدمی تعینات ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار پوچھا، کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ ''میں جارج برناڈ شا ہوں، اور لندن سے آیا ہوں'' میں نے اپنا تعارف کرایا، لیکن انہیں یقین نہیں آیا، بیگ صاحب ان دنوں قانونی ماہرین سے مشورہ کر رہے ہیں اوران کا زیادہ تر وقت قانونی کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ محاذ رائے شماری کو خلاف قانون قرار دیئے جانے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے بتایا کہ غیر قانونی سرگرمیوں کی روک تھام کے قانون کی رو سے پہلے یہ معاملہ ٹریبونل کے سامنے جانا ہے اس کے بعد ہی سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا مرحلہ آئے گا۔

بیگ صاحب کے ساتھ گفتگو کے دوران مجھے یہ محسوس ہوا، کہ محاذ رائے شماری بالواسطہ طور پر بھی انتخابات میں حصہ نہیں لے گا۔ یعنی محاذ کے کارکن آزاد اُمیدواروں کی حیثیت سے بھی انتخاب نہیں لڑیں گے۔ لیکن انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے لئے بھی کوئی ہدایت جاری نہیں کی جائے گی۔

بیگ صاحب نے کہا کہ حکومت نے ہمیں انتخابی میدان سے دور رکھنے کے لئے جو فسطائی ہتھکنڈے استعمال کئے ہیں، ان کے پیش نظر موجودہ حکومت سے کسی قسم کے Fair Play کی توقع رکھنا بے کار ہے۔ میں نے دریافت کیا، کہ مجھ جیسے سرپھرے نوجوانوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ جو ہر ہر قدم پر اس فسطائیت کا مقابلہ کرنے پر بضد ہیں؟

''ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں'' بیگ صاحب نے شیخ صاحب کا فقرہ دہرایا۔

کشمیر میں پارلیمانی انتخابات کے موضوع پر دہلی میں کچھ اہم سیاسی شخصیات سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ مسٹر جے سنگھ اور ان کے ساتھی اس بات کے لئے بہت کوشاں ہیں کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کی جلاوطنی کے بعد کشمیر میں انتخابات کے نام پر جو کچھ بچ گیا ہے، اس کی حفاظت کی جائے۔ مسٹر جے سنگھ نے مجھے جے پرکاش نرائن کا یہ پیغام دیا، کہ وہ انتخابات کے دوران سرودیہ کارکنوں کی ایک ٹیم کشمیر بھیجیں گے اور یہ کارکن لوگوں کو منظّم ہوکر حکمران جماعت کی دھاندلیوں کا مقابلہ کرنے کی تحریک، ترغیب اور تربیت دیں گے، اس سلسلے میں نئی دہلی میں جے پرکاش نرائن کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جارہی ہے جو کشمیر کے انتخابات کی نگرانی کرے گی۔

مارچ ۱۹۷۳ء

ڈاکٹر کرن سنگھ کا استعفیٰ:-

ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنی راجپوتی شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرکزی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ انہوں نے حیدر آباد میں ایورو ہوائی جہاز کے حادثے کو اپنی اخلاقی ذمہ داری قرار دے کر پارلیمنٹ میں بڑے ڈرامائی طریقے سے اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔ کانگریسی وزیروں سے اس قسم کے جرأت مندانہ اور باوقار فیصلوں کی کوئی توقع نہیں رکھتا۔ اور اسی لئے ڈاکٹر صاحب کے اس فیصلے پر اکثر ممبروں نے بیک وقت مسرت اور حیرت کا اظہار کیا۔ مسرت اس لئے کہ ہندوستانی سیاست کے خاکستر میں ابھی تک کچھ چنگاریاں موجود ہیں۔ حیرت اس لئے کہ ایک معمولی ہوائی حادثے پر اتنا سنگین ردِ عمل! ایون میں اکثر ممبروں نے جہاں ڈاکٹر کرن سنگھ کو اس جرأت مندانہ قدم پر مبارکباد دی وہاں یہ توقع بھی ظاہر کی، کہ وہ اپنے

اس فیصلے پر نظر ثانی کرینگے۔ ہوائی جہاز کے حادثے کے دوسرے دن جب لوک سبھا میں استعفیٰ کا حادثہ پیش آیا، تو میں جموں میں تھا، اس لئے اپنے ردِ عمل کا اظہار نہ کرسکا تھا، لیکن دوسرے دن دہلی پہنچ کر میں نے انہیں شاندار اور قابلِ تقلید مثال قائم کرنے کے لئے مبارکباد دی، میں نے پوچھا کہ چھ سال تک کانگریس راج میں وزیر رہنے کے بعد بھی یہ غیرت، یہ خودی اور یہ اخلاقی جرأت کہاں اور کس طرح محفوظ رہی۔ ''میرے خون میں'' ڈاکٹر صاحب نے ایک زوردار قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا کہ ''سیاست کی اس بے اصول اور بے رحم دنیا میں ان قدروں کو زندہ رکھنے کے لئے اپنا لہو جلانا پڑتا ہے اور مجھے خوشی ہے، کہ میرے دوست احباب کے علاوہ میرے سیاسی مخالفین نے بھی میرے اس فیصلے کو سراہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ ''یورانی صاحبہ کا کیا ردعمل ہے؟'' تو جواب دیا، کہ یہ میرا اور ان کا مشترکہ فیصلہ ہے، اور میں نے وزیراعظم کو استعفیٰ کا خط بھیجنے سے پہلے صرف ان سے مشورہ کیا اور انہوں نے میرے ضمیر کے فیصلے کی تائید کی! ڈاکٹر صاحب سے پندرہ بیس منٹ کی گفتگو کے دوران مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے استعفیٰ کے فیصلے سے زیادہ اس ردِعمل پر خوش ہیں کہ جواُن کے دوست احباب، سیاسی رفقاء اور کابینہ میں ان کے بعض ساتھی ظاہر کررہے ہیں۔ انہوں نے یہ بات بالکل واضح کردی، کہ وہ سیاست چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، اور کسی بیرونی ملک میں سفارتی عہدہ سنبھالنے کا کوئی سوال ہی نہیں، ''میری خدمات وزیراعظم کو ہمیشہ حاصل رہیں گی۔ اور وہ جس حیثیت میں ان کا استعمال کرنا چاہیں کرسکتی

ہیں، لیکن میں ملک چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں'' ڈاکٹر کرن سنگھ نے کچھ اس انداز سے کہا کہ جیسے وہ مجھ سے نہیں وزیر اعظم سے مخاطب تھے۔

ڈاکٹر کرن سنگھ کے بعض سیاسی خیالات، ان کے ذہنی رویے، ان کی روایت پسندی اور ماضی پرستی سے مجھے سخت اُلجھن اور کوفت ہوتی ہے، میں ایک عرصے سے ان کے سیاسی کٹڑپن اور تنگ نظری سے مایوس ہو کر ان سے بیزار ہوں، لیکن ایک معمولی حادثے پر ان کی اخلاقی جرأت کے مظاہرے نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں اس کے لئے انہیں داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلے سورگباشی لال بہادر شاستری نے بھی ایک بار ایک ریلوے حادثے پر وزارت سے استعفیٰ دیا تھا۔ لیکن اس وقت عام انتخابات میں صرف دو تین ماہ باقی تھے اور شاستری جی نے اس استعفیٰ سے ایک سیاسی مقصد حاصل کیا تھا۔ اس کے برعکس ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنے استعفیٰ سے اپنا کام مشکل اور سیاسی رقیبوں کا کام آسان بنا دیا ہے۔ کیونکہ راجدھانی کے سیاسی حلقوں میں یہ افواہ بھی گشت کر رہی ہے کہ مسز گاندھی ڈاکٹر صاحب موصوف سے اپنا پلو چھڑانا چاہتی تھیں اور ان کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی افادیت ختم ہو چکی تھی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس افواہ میں کتنی صداقت ہے؟ لیکن میرا اپنا اندازہ ہے کہ وزیر اعظم ڈاکٹر صاحب کا استعفیٰ منظور نہیں کریں گی۔ کیونکہ وزیر کی حیثیت سے ان کی کارکردگی قابل تعریف ہی نہیں قابل تقلید بھی رہی ہے۔ لیکن مسز گاندھی کا کوئی بھروسہ نہیں، دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

رشید صاحب کا عروج وزوال:۔

پارلیمنٹ کا سنٹرل ہال بھی ایک عجیب جگہ ہے ۔ یہاں ممبرانِ پارلیمنٹ، اراکینِ کابینہ اور بڑے بڑے ملکی اخبارات کے نمائندگانِ خصوصی کے علاوہ سابق وزیروں، وزرائے اعلیٰ اور ہارے ہوئے ممبران پارلیمنٹ کی ایک بڑی تعداد بھی نظر آتی ہے۔ پارلیمنٹ کے پرانے ممبر جو دوبارہ منتخب نہ ہوسکے ہوں، مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ جو عدم اعتماد یا صدر راج کے نفاذ کی وجہ سے بے کار ہو گئے ہوں، سابق وزراء جو کابینہ کی توسیع اور کانٹ چھانٹ کے عمل میں اپاہج بنادئے گئے ہوں، یہاں آکر ایک ہی صف میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پچھلے دنوں سنٹرل ہال میں بیک وقت دو ایسی ہستیاں نظر آئیں کہ جو اکثر ممبران کی توجہ اور دلچسپی کا باعث بن گئیں۔ ایک محترمہ نندنی ست پتی صاحبہ جو اُڑیسہ سے بہت بے آبرو ہوکر نکل بھاگنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ اس خاتون کو مسز گاندھی نے اُڑیسہ پر مسلط کیا تھا، لیکن یہ وہاں سے کانگریس کا جنازہ نکال کر لوٹیں۔ پہلے راجیہ سبھا کی ممبر تھیں، بڑی مشکل سے اُڑیسہ اسمبلی کا الیکشن جیتا تھا، لیکن اس جیت کے ساتھ اقتدار کی بازی بھی ہاردی اور راجیہ سبھا کی ممبری بھی، نندنی جی، سب کچھ ہار کر اب سنٹرل ہال میں اپنی بپتا سنا رہی تھیں۔ اور خاص توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ دوسری قابلِ ذکر اور دلچسپ شخصیت، پارلیمنٹ کے سابق ممبر بخشی عبدالرشید کی تھی۔ بخشی صاحب کئی سال بعد سنٹرل ہال میں نظر آئے تھے، اس لئے ان کے بہت سے ہمعصر انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ اکثر نئے ممبروں کو معلوم نہیں تھا، کہ رشید صاحب کی ذات گرامی میں کیا کیا صفات پائی جاتی ہیں، اس

لئے مجھے ان کا مفصل تعارف کرانا پڑا (رشید صاحب کی پیٹھ پیچھے)

وہ پارلیمنٹ میں ایک دو نہیں پورے دس سال رہے ہیں۔ اور انہوں نے اپنی خاموشی سے پارلیمنٹ کی کاروائی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہ سنٹرل ہال میں بیٹھے ان دنوں کو یاد کررہے تھے، کہ جب ان کے نام کا سکّہ چلتا تھا اور جب اسی ہال میں بڑے بڑے وزیر انہیں جھک کر سلام کیا کرتے تھے۔ جب سے اب تک دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ آج صرف پارلیمنٹ کے معمولی ملازم بھی انہیں رسمی سلام کر کے گذر جاتے تھے۔ اور رشید صاحب ایک ایسا کھنڈر دکھائی دے رہے تھے، کہ جسے دیکھ کر لوگ زمانے کی بے ثباتی اور اقتدار کی ناپائیداری کا سبق حاصل کرتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے ایک بہت پرانے ملازم پانڈے جی رشید صاحب کو دیکھ کر مجھ سے کہنے لگے۔

''بادشاہ تھے حضور، بادشاہ اپنے وقت کے۔''

میں نے پوچھا ''بادشاہ صاحب نے کبھی پارلیمنٹ میں زبان کھولی تھی؟'' ''ہم نے تو نہ کبھی سنا، اور نہ دیکھا۔ لیکن بادشاہوں کو زبان کھولنے کی ضرورت بھی کیا ہے!'' پانڈے جی نے کہا۔ پھر بخشی رشید صاحب سے ہماری ملاقات، جموں سکریٹریٹ میں لاء سیکریٹری غلام شاہ کے کمرے میں ہوئی۔ جہاں رشید صاحب غالباً کسی کی سفارش کرنے گئے تھے۔ رشید صاحب کے چہرے پر مجھے ایک وحشت ناک خاموشی اور سنجیدگی نظر آئی۔ کسے معلوم تھا کہ اپنے وقت کا یہ فرعون ایک دن اتنا معصوم اور مظلوم نظر آئے

گا کہ اسے دیکھ کر دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ اقتدار اور اختیار کے مسندوں پر بیٹھے ہوئے مفتی سعید و! بخشی رشید کے انجام سے سبق لو۔

علی گڈھ اور ہندوستانی مسلمان !:-

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کا سوال ہندوستانی مسلمان کے لئے عزت و آبرو کا ہی نہیں، اپنی سیاسی قوت کی آزمائش اور اپنی زبوں حالی کے خلاف احتجاج کی علامت بھی بن گیا ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان کا مسلمان ذہنی اور فکری قیادت سے ہی نہیں، بلکہ سیاسی اور نظریاتی وابستگی سے بھی محروم ہو گیا۔ عدم تحفظ کے احساس نے اسے کبھی کانگریس کی گود میں ڈال دیا اور کبھی مسلم لیگ اور مسلم مجلس کے اصطبل میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کہیں کہیں مسلمانوں نے جن سنگھی قاتلوں سے بھی مفاہمت کی جسارت وحماقت کی۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے!

ان تمام ”تجرباتی“ اور وقتی سمجھوتوں نے مسلمانوں کے بنیادی مسائل حل کرنے کی بجائے ان کی مایوسی اور محرومی میں اضافہ کر دیا اور ملک کی سب سے بڑی اور موثر اقلیت ہونے کے باوجود حکمران کانگریس نے ان کے جذبات اور مفادات کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ سیاسی بے بسی اور

سماجی بحران کے اس عالم میں ہندوستانی مسلمانوں کو متحد اور متفق ہونے کے لئے ایک مرکز، ایک علامت اور ایک تحریک کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے پوری کردی ہے! علی گڈھ صرف ایک تعلیمی ادارے کا نام ہی نہیں، سیاسی اور سماجی زندگی میں مسلمانوں کے عدم تحفظ کی علامت بھی ہے!

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف دہلی میں حالیہ کنونشن کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے اور اس مسئلے پر مختلف سیاسی جماعتوں نے مسلمانوں کو جو اخلاقی حمایت دی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کہ مسلمانوں کے جس سیاسی وجود کو حکمران کانگریس نے اقتدار مطلق کے زعم میں نظر انداز کر دیا تھا۔ اسے مخالف سیاسی جماعتوں نے تسلیم کیا ہے اور مسلمان آزادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی سیاسی قوت اور اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر اپنا وجود منوانے پر تلا ہوا ہے۔

دہلی میں منعقدہ کنونشن میں زیادہ زور ان انتہا پسند مسلمانوں کا تھا، کہ جو علی گڈھ کے سوال پر جان کی بازی لگانے کے حق میں تھے۔ اور جن کے لئے یہ مسئلہ موت اور حیات کا مسئلہ بن گیا ہے۔ جذباتی اور بعض اوقات اشتعال انگیز تقریروں سے پیدا شدہ ماحول میں عقل، توازن اور دور اندیشی کی بات کرنے کے لئے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے اور یہ امر باعث اطمینان ہے، کہ اس جذباتی سیلاب کو ایک صحیح سمت عطا کرنے میں جناب شیخ محمد عبداللہ نے ایک تاریخی رول ادا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے

مجروح جذبات اوران کے بگڑے ہوئے تیوروں کے باوجود شیخ صاحب نے انہیں پرامن احتجاج اور آئینی جدوجہد کا مشورہ دیا۔ انہوں نے بپھرے ہوئے نوجوانوں کو دوراندیشی اورموقع شناسی کا درس دے کر ایک مسلسل تحریک چلانے پر آمادہ کیا اوراس طرح علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سوال پر تشدد، تخریب اور توڑ پھوڑ کا ارادہ رکھنے والے لوگوں کو طویل مگر بامقصد جدوجہد کا راستہ دکھایا۔

کنونشن میں شریک کئی دوستوں نے مجھے بتایا کہ شیخ صاحب کی بروقت مداخلت اور ان کی رہنمایانہ صلاحیتوں نے ایک نہایت نازک صورت حال کو بچایا۔ لیکن اگر مسز اندا گاندھی اوران کے رفقاء کار نے علی گڈھ کے سوال پر مسلمانوں کے شدت جذبات کا اندازہ کرنے میں کوئی تاخیر یا غلطی کی تو شیخ صاحب جیسے متوازن ذہن رکھنے والے مسلمان لیڈروں کی آواز بے اثر ہوجائیگی۔ اور علی گڈھ کی تحریک ناپختہ ذہنوں اور بے قابو نوجوانوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اوراس سے علی گڈھ اور مسلمانوں ہی کو نہیں مسز گاندھی کی حکومت کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

نوجوان ڈاکٹر بدقسمت مریض:۔

کل میں آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں گاندربل کے ایک نوجوان ڈاکٹر بشیر احمد کی عیادت کے لئے گیا تھا۔ یہ تیس بتیس سالہ بدنصیب نوجوان ایک نہایت ہی موذی اور جان لیوا مرض میں مبتلا ہے اور انسٹی چیوٹ کے ڈاکٹر اسے موت سے بچانے کے لئے سرتوڑ کوششیں کررہے

ہیں۔ ڈاکٹر بشیر کے دونوں گردے بے کار ہو چکے ہیں اور ان کے جسم میں خون کی گردش اور صفائی کا قدرتی انتظام معطل ہو گیا ہے۔ اس سے ان کے سارے بدن میں ایک خطرناک زہر پیدا ہو گیا ہے۔ جب تک آپریشن کے ذریعے ان کے دونوں گردے نکال کر کم از کم ایک نیا گردہ Transplant نہ کیا جائے۔ ان کی موت قریبی بھی ہے اور یقینی بھی۔ ہندوستان میں ایک گردہ نکالنے کا کام بھی بہت نازک اور مشکل سمجھا جاتا ہے۔ دونوں نکال کر ایک نیا گردہ نکالنے کا کام بھی انتہائی پُر خطر اور نازک سمجھا جاتا ہے اور پھر نیا گردہ لگانے میں اکثر یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ کہیں مریض کا جسم اس نئے اور بیرونی عضو کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دے۔ دلی میں گردوں کا کوئی بنک تو ہے نہیں، اس لئے بدنصیب ڈاکٹر بشیر کے کئی بھائی اور ان کی بہن، دلی میں جمع ہیں تاکہ ان میں سی کسی ایک کا گردہ نکال کر ان کے مرتے ہوئے بھائی کو موت کے منہ سے بچانے کی آخری کوشش کی جائے، ڈاکٹر بشیر اس وقت ایک مصنوعی گردے کے سہارے زندہ ہیں اور دن میں کئی بار مشین سے ان کا خون صاف کیا جاتا ہے۔ مریض کو ابھی تک صحیح صورت حال کا علم نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کا صرف ایک گردہ خراب ہے۔ جسے آپریشن کے ذریعے باہر نکال کر وہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ زندگی پر ابھی تک اس کا بھروسہ بدستور قائم ہے اور اسے ایک ڈیڑھ ماہ تک مکمل طور صحت یاب ہونے کی اُمید ہے۔ اُس معصوم کو اُس ذہنی کرب اور مایوسی کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ کہ جس سے اس کے عزیز

واقارب اور معالج گذر رہے ہیں۔ ہندوستان سے باہر لندن یا امریکہ میں گردے کے Transplant کا آپریشن مشکل ہے، لیکن خطرناک نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ گاندربل کا یہ بدقسمت نوجوان لندن یا امریکہ جانے کے اخراجات کہاں سے برداشت کر سکے گا؟ مس مردولا سارابائی کچھ روپے جمع کرنے کے لئے رات دن سرگرداں ہیں، لیکن ہندوستان سے باہر آپریشن پر کم از کم تیس چالیس ہزار روپے کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ ایک ایسا کام ہے کہ جس میں حکومت جموں و کشمیر کو بھی اپنا حصہ ادا کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر بشیر، منی گام گاندربل میں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے اس موذی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور اس نوجوان کو نئی زندگی دینے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ تیس بتیس برس کی عمر ایک نوجوان بیوی کا شوہر، دو معصوم بچوں کا باپ، ڈاکٹر بشیر کو معقول علاج مہیا نہ ہونے کی وجہ سے مرنا نہیں چاہیئے۔!

اگست ۱۹۷۵ء

مریض ڈاکٹر :-

پچھلے دنوں میرے ایک ڈاکٹر دوست جواب انگلستان میں آباد ہوگئے ہیں، کشمیر آئے ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب سرینگر کے ایس پی کالج میں میرے ہم عصر اور ہم جماعت رہ چکے ہیں ، اور ہم دونوں نے ، اپنی نالائقی کے باوجود ایک ساتھ ڈاکٹر بننے کی سرتوڑ کوشش کی تھی ۔ ان کی خوش بختی ،ان کی نالائقی پر غالب آ گئی ،اووہ ڈاکٹر بن گئے ۔ اور میری سیاہ بختی کا یہ عالم کہ میں ڈاکٹر تو کیا کمپوڈر بھی نہ بن سکا۔ ڈاکٹر صاحب ، اِس کے بعد لندن گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے ،اب ہر سال کشمیر ارباب کل کی بے کسی اور بے بسی کا مذاق اُرانے کے لئے کشمیر آتے ہیں پچھلے سال ، لندن میں میری ان سے ملاقات ہوئی ،توانہوں نے میری بڑی خاطر کی ، ملتے ہی مجھے اپنے موٹروں کی تعداد اپنی ماہانہ آمدن اور اپنے شاہانہ اخراجات کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ذرا فرصت اور قدرے تفصیل کے ساتھ مجھے عیش وعشرت کا وہ ساز وسامان دکھایا کہ جوانہوں نے جرمنی ، سوئز رلینڈ ، فرانس

اور نہ معلوم کس کس ملک سے خریدا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میری خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، لیکن اس اہتمام کا مقصد بھی دولت وثروت کی نمائش اور اپنی شان وشوکت کا اظہار تھا، اور ان دو دن کے قیام کے دوران کسی دوسرے مسئلے پر ان سے بات چیت کا کوئی موقع ہی نہیں نکل سکا۔ ریلوے سٹیشن پر مجھے وداع کرتے وقت بھی وہ یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو اپنی موٹر گاڑی میں گھما نہ سکا۔ کیوں کہ وہ عام طور پر میری بیوی ڈرائیو کرتی ہیں'' ...... اپنی ذات اور اپنی دولت سے ڈاکٹر صاحب کا یہ غیر معمولی لگاؤ، ایک نفسیاتی بیماری، احساس کمتری کی علامت ہے اور کینسر کی طرح چونکہ ابھی تک اس بیماری کا کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے، اس لئے بے چارے ڈاکٹر صاحب ہماری ہمدردی اور رحم کے مستحق ہیں۔

پچھلے ہفتے سرینگر میں ڈاکٹر صاحب سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں اور ان دو ملاقاتوں میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہر جاننے والے ڈاکٹر کی بُرائی کی۔ جہاں کسی دوسرے ڈاکٹر کا نام آیا۔ انہوں نے فوراً فیصلہ صادر کر دیا کہ وہ تو بالکل فراڈ ہے۔ یا بے حد نالائق اور نکما، ایک بار بھی ان کی زبان پر کسی دوسرے ڈاکٹر کے لئے تعریف وتحسین کا ایک فقرہ نہیں آیا۔ ان کے بیان کے مطابق لندن میں جتنے کشمیری ڈاکٹر ہیں۔ وہ سب کام چور اور کفن چور ہیں اور کشمیر کے سب ڈاکٹر اتنے نالائق اور ناکارہ ہیں کہ انہیں ڈاکٹر کہنا ہی غلط ہے لندن میں بھی اور یہاں بھی، میں ان کی زبان سے کسی ڈاکٹر کے حق میں ایک تعریفی جملہ سننے کے لئے ترس گیا۔ اور پھر اتفاق ایسا ہوا کہ ڈاکٹر

صاحب اور میں دونوں ایک ہی جہاز سے دہلی جا رہے تھے اور ایک گھنٹے کے اس ہوائی سفر کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہوں نے ہوائی جہاز میں بھی کشمیر اور کشمیری ڈاکٹروں کی بُرائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر میں انہوں نے ایک ڈاکٹر کی تعریف کرنا شروع کی۔ اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے۔ کہ وہ بڑا قابل اور محنتی ہے اور اگر وہ اسی طرح لگن سے کام کرتا رہے، تو بہت اچھا ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ لیکن اس میں ایک بُرائی ہے کہ وہ ہر دوسرے ڈاکٹر کی بُرائی کرتا رہتا ہے......" ڈاکٹر صاحب کی زبان سے یہ فقرہ سن کر میں دم بخود رہ گیا۔

غیر متزلزل اعتقاد:-

وزیرِ اعلیٰ سے وابستہ تعلقاتِ عامہ کے افسر صدرالدین مجاہد نے گزشتہ دنوں، ان درخواست ہا کے اعداد و شمار برائے اشاعت جاری کر دیئے ہیں کہ جو پچھلے سو دن کے دوران شیخ صاحب کے دفتر میں وصول کیئے گئے اور جن کو مختلف محکموں کے پاس ضروری کاروائی کیلیئے بھیجا گیا۔ ان درخواستوں کی کل تعداد بارہ ہزار بتائی جاتی ہے اور ان اعداد و شمار کی اشاعت کا مقصد غالباً یہ ظاہر کرتا ہے کہ شیخ صاحب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سے کتنے لوگ اب تک اپنے مسائل حل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کر چکے ہیں۔ مجاہد صاحب کی نیت ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان کی علمیت مشکوک ہے، انہیں شاید اس بات کا علم نہیں کہ اہلِ کشمیر کو درخواست پر بڑا اعتقاد ہے۔ اور وہ وقت، بے وقت، محل بے محل درخواست دینے میں اپنا

جواب نہیں رکھتے، سر والٹر لارنس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ویلی آف کشمیر'' میں کشمیریوں کی اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں کے لوگوں کا تحریری درخواست پر بے پناہ اعتقاد ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ درخواست سے ان کی ہر مشکل حل ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ ''ایک دفعہ میں بندوبست اراضی کے سلسلے میں ایک گاؤں کے باہر خیمہ زن تھا۔ جہاں صبح سے شام تک لوگ سینکڑوں کی تعداد میں آکر درخواست دے جاتے ہیں۔ خیمے سے کچھ دور کھلی ہوا میں ایک عارضی بیت الخلا (Latrin) کھڑا کردیا گیا تھا۔ اور ایک دن میں علی الصبح رفع حاجات سے فارغ ہورہا تھا۔ کہ اوپر سے ایک کاغذ کا ورقہ گر گیا اُٹھا کر دیکھا، تو یہ کسی دیہاتی کی درخواست تھی''! تقریباً ایک صدی بعد بھی نہ برادران وطن کی یہ عادت گئی ہے اور نہ درخواست کی افادیت پر ان کا اعتقاد و اعتماد کمزور ہوا ہے بلکہ خواندگی کی شرح بڑھ جانے اور کاغذ کی فراوانی سے اس قومی مشغلے کو پہلے سے زیادہ تقویت مل گئی ہے اور وزیراعلیٰ کے نام صرف سو دن میں بارہ ہزار درخواستیں وصول ہونے سے نہ شیخ صاحب کی مقبولیت ثابت ہوتی ہے اور نہ مجاہد صاحب کی افادیت، اس سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ کشمیریوں کی عادات نہیں بدلی ہیں! بہر کیف، سو دن میں بارہ ہزار درخواستوں کا مطالعہ بہت ہی محنت طلب اور صبر آزما کام ہے، اور اس کے لئے مجاہد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ درخواست یعنی Application کے سلسلے میں

بیگ صاحب کا ایک لطیفہ یاد آ گیا، آپ بھی سن لیجئے ، بیگ صاحب کا بیان ہے کہ وزیر مال ہونے کے بعد ایک صاحب بڑی نیاز مندی کے ساتھ ان کے ہاں تشریف لائے ، انہیں بہت سی دعائیں اور مبارکبادیاں دیں۔اور روانہ ہوتے وقت انہوں نے انگریزوں کی زبان میں، کچھ ان الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کیا۔

You Are my father, without any application

اُردو میں اس کا ترجمہ کچھ یوں ہوگا کہ ''آپ بغیر کسی درخواست کے میرے باپ ہیں۔'' یہ تو ہوا لفظی ترجمہ۔ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ'' آپ میرے باپ کی جگہ ہیں اور یہ بات میں بغیر کسی غرض، مطلب یا استدعا کے کہہ رہا ہوں۔

لاشوں کی تجارت:-

اس اخبار کی گزشتہ اشاعت میں آپ نے میرے نابینا دوست احرار صاحب کے متعلق پڑھا ہوگا کہ وہ بڑے کٹر قسم کے بکرے تھے اور میر واعظ خاندان سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی، ان کی ذات اس اعتبار سے مجموعہ اضداد تھی، کہ وہ بیکوقت مولوی عبداللہ وکیل اور میر واعظ خاندان سے اُنس رکھتے تھے حالانکہ دونوں خاندانوں میں نہ صرف یہ کہ کوئی قدر مشترک نہیں تھی، بلکہ ان میں سخت رقابت اور دُشمنی کا سلسلہ چلتا آیا ہے، بہر حال احرار صاحب ایسے بے ضرر ، بے ریا اور مخلص آدمی تھے کہ میں نے کبھی ان کی سیاست پر کوئی توجہ نہیں دی ۔ کبھی کبھار صرف چھیڑنے کی غرض سے

میں فاروق صاحب یا پاکستان کی نسبت کچھ کہہ دیتا، تو وہ سخت برہم ہو جاتے اور ان کی اس برہمی سے ہم سب لطف لیتے ، احرار صاحب ۳ مئی کو اس دنیائے سے رخصت ہوئے اور اس سے ایک سال قبل وہ کافی بیمار رہے اور کئی بار انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اس دوران میں احرار صاحب کے دوسرے بہت سے دوست باقاعدگی سے ان کی مزاج پرسی کرتے رہے۔ اور ان کی موت سے صرف چند دن پہلے، میں ان کی قیام گاہ پر بھی ان کا حال احوال دریافت کرنے گیا تھا۔ لیکن اس ایک سال کے دوران میرواعظ محمد فاروق یا ان کے خاندان کے کسی فرد نے ایک بار بھی احرار مرحوم کی خبر نہ لی۔ اس کی نہ مجھے اور نہ احرار صاحب کے لواحقین کو کوئی شکایت ہے۔ لیکن اس بات کا مجھے بے حد افسوس ہے، کہ احرار صاحب کی موت کے بعد فاروق صاحب اور ان کی جماعت عوامی ایکشن کمیٹی نے انہیں مجاہد بنا کر اپنے سیاسی مفادات کے لئے استعمال کرنے کی نازیبا کوششیں شروع کر دی ہیں۔ جمعہ کے روز نواب بازار عوامی ایکشن کمیٹی نے احرار صاحب کے گھر پر تعزیتی جلسے کے بہانے اپنے سیاسی مخالفوں کو بُرا بھلا کہا۔ اور فاتحہ خوانی کے لئے آئے ہوئے سینکڑوں لوگوں کو فاروق صاحب اور میر واعظ خاندان کی تعریفیں سننے کے لئے مجبور کیا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ احرار صاحب کی موت کا استحصال ہے۔ اور اگر عوامی ایکشن کمیٹی کے لیڈروں میں سیاسی دیانت اور شرافت ہوتی، تو وہ ایک نیک اور مخلص آدمی کی موت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال نہ کرتے، اس جلسے میں تقریر کے لئے خاص طور پر

اس حلقے کے ممبر اسمبلی عبدالرشید کابلی کو مدعو کیا گیا تھا۔ اور کابلی صاحب نے اپنی دھواں دھار تقریر میں مرحوم احرار سے وہ ایثار اور وہ معجزے منسوب کئے۔ کہ یہ تقریر سن کر بے چارے احرار کی روح شرمندہ ہوئی ہوگی۔ فاروق صاحب ہی کی طرح گزشتہ سال، ڈیڑھ سال کے دوران میں نے کبھی کابلی صاحب کو احرار صاحب کی خبر خیریت دریافت کرتے نہیں دیکھا۔ لیکن ان کی موت کے بعد ان کی شخصیت پر تقریر جھاڑنے کا موقع وہ ہاتھ سے کیوں جانے دیتے! بات یہ ہے کہ آج کا سیاستدان لاشوں کی تجارت کو بھی جائز سمجھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کابلی صاحب جیسے بہت سے سیاسی گدھ احرار صاحب کی لاش پر منڈلانے لگے ہیں!

ہفتہ واری صحافت :-

اس اخبار کی گزشتہ اشاعت میں، میں نے اخبار والوں کی بے خبری، کے عنوان سے مقامی ہفت روزوں کے متعلق اپنے جو تاثرات پیش کئے تھے، اس پر بہت سے ہفتہ وار اخبارات کے مدیران کرام نے سخت ناراضگی اور برہمی کا اظہار کیا ہے۔ میری تنقید کے جواب میں کچھ مقالے لکھے گئے ہیں۔ کچھ لکھے جارہے اور کچھ لکھوائے جارہے ہیں۔ اور میرا ارادہ یہ ہے کہ ان میں سے کچھ دلچسپ اقتباسات قارئین ''آئینہ'' کی ضیافت طبع کے لئے آئندہ کی اشاعت میں شائع کروں۔ فی الحال آپ کو صرف یہ اطلاع فراہم کرنا چاہتا ہوں، کہ سرینگر سے کل ۳۶ ہفتہ وار اخبارات اور جموں سے تقریباً ۸۵ ہفت نامے شائع ہوتے ہیں۔ یہ اخبارات شائع ہو کر کہاں جاتے

ہیں؟ مجھے معلوم نہیں ۔لیکن چونکہ شائع ہوتے ہیں، اس لئے کہیں نہ کہیں ضرور جاتے ہوں گے۔

ستمبر ۱۹۷۵ء

مجھے میرے ناصحوں سے بچاؤ:۔

آپ نے اس بوڑھے، گھوڑے، اور لونڈے کی حکایت سنی ہوگی کہ ایک ساتھ کہیں سفر پر جارہے تھے اور جو ہر شخص کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس درجہ پریشان ہوگئے کہ بالآخر اُنہیں گھوڑا بیچ کر پیدل سفر کرنا پڑا۔ جب سے ''آئینہ'' روزانہ ہوگیا ہے۔ میری حالت بھی کچھ اس طرح کی ہوگئی ہے۔ صبح سے شام تک ہر شخص مجھے اپنے مشوروں سے مستفید کرتا رہتا ہے۔ یہ مشورے اپنی اہمیت ،نوعیت ، اور کمیت و کیفیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور متضاد ہیں کہ اگر میں بیک وقت ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کروں تو ''آئینہ'' کے روزانہ سے پھر ہفتہ وار اور بالآخر ماہوار بن جانے کا زبردست امکان اور خطرناک اندیشہ پیدا ہوسکتا ہے۔ مشورہ دینے والے اکثر احباب بہت مخلص اور (بدقسمتی سے) بے حد مفلس ہیں ۔اس لئے میں نہ ان کے خلوص پر شک کرسکتا ہوں اور نہ ان کی نیت پر مجھے اگر شک ہے تو وہ ان کے صحافتی تجربے پر ہے۔لیکن اس کے باوجود میں

''آئینہ'' سے ان کی غیر معمولی دلچسپی اور مدیر ''آئینہ'' سے ان کی گہری وابستگی کے لئے ان کا بے حد شکر گذار ہوں مشکل صرف یہ ہے کہ میں ان کے متضاد مشوروں اور مختلف تجربوں سے فائدہ اُٹھانے سے معذور ہوں۔

''آئینہ'' کے روز نامہ بن جانے کے دوسرے دن بعد ایک دوست دفتر پر نہیں، میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھے ہفت روزہ اور روز نامے کا فرق سمجھانے لگے، میں بڑی توجہ اور دلچسپی سے ان کے تاثرات سُنتا رہا اور انہیں یقین ہوگیا کہ میں اب اچھی طرح سے ہفتہ وار اور روز نامے کا فرق سمجھ گیا ہوں۔ لیکن دوسرے دن ٹھیک اسی وقت وہ پھر نازل ہوگئے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کا دوسرا پرچہ بھی روز نامہ کم اور ہفت روزہ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے انہیں یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ کہ ان کے تجربات سے مکمل طور فائدہ اُٹھانے کے لئے مجھے کم از کم ایک مہینے کی مہلت چاہئے اور میں اس محنت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی یہ ڈائری قلم بند کر رہا ہوں۔

ایک اور دوست کا خیال ہے کہ روز نامہ ''آئینہ'' کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور بھاری ہوگیا ہے اور اس میں وہ چاشنی نہیں ہے کہ جو ایک عام پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اخبار میں جب تک کچھ چٹ پٹی خبریں اور طنز و مزاح کے ایک دو کالم نہ ہوں۔ مزا نہیں آتا۔ اس لئے سنجیدگی چھوڑ کر کچھ چٹنی مصالے کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔

دوسرے صاحب کی نظروں میں روز نامہ ''آئینہ'' ضرورت سے زیادہ ہلکا پھلکا ہے۔ اور اس میں طنز و مزاح کا عنصر کچھ کم ہونا چاہئے۔ ان کے خیال

میں ''باتیں کوہکن کی'' اور ''سنگ ریزے'' دونوں میں سے صرف ایک کالم باقی رہنا چاہئے۔ایک صحافی دوست کی رائے یہ ہے کہ '' آئینہ'' روزانہ اخبار کی بجائے ایک ادبی جریدہ معلوم ہوتا ہے اور زبان لب ولہجہ اور خبروں کی ترتیب کے لحاظ سے یہ صحافتی کارنامے سے زیادہ ادبی تخلیق کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس ایک ادیب دوست کا مشورہ یہ ہے کہ اس میں صرف روزمرہ کے سیاسی اور سماجی مسائل پر نہیں۔ علمی اور ادبی موضوعات پر بھی اظہار خیال ہونا چاہئے۔ تاکہ یہ ہر ذوق اور ہر شوق کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔

ایک خیر خواہ کا مشورہ ہے کہ اخبار کے پہلے صفحے پر فوراً کارٹون'' چالو کرو، کیونکہ ان کے نزدیک کارٹون کے بغیر اس شہر بلکہ ریاست میں کوئی اخبار چل ہی نہیں سکتا۔ وہ ایمان داری سے اس بات کے قائل ہیں کہ ایک مقامی روزنامہ صرف کارٹون کے سہارے ہی پچھلے تین چار سال سے چل رہا ہے۔ ایک اور خیر خواہ کو شکایت ہے کہ '' آئینہ'' میں خبریں کم اور تبصرے زیادہ ہوتے ہیں اور اس دور میں مضمون اور مقالے پڑھنے کی کس کو فرصت ہے۔ ان کے خیال میں اغوا، چوری، حادثوں اور لڑائیوں کی خبریں صفحہ اوّل پر شائع کی جانی چاہیں۔ تاکہ اخبار چند ہی دنوں میں کثیر الاشاعت بن جائے۔ یہ قیمتی مشورہ بھی اس ہمدرد نے دیا ہے کہ ہفتے میں ایک بار فلمی ایڈیشن شائع ہونا چاہئے۔ جس میں فلمی اداکاروں کی ''اشتعال انگیز'' تصاویر شائع کی جائیں۔ انہیں یقین ہے کہ اس کے بعد دوسرا اخبار کا

''آئینہ'' کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بچوں کی نفسیات کے ایک ماہر نے تحریری طور پر یہ مشورہ دیا ہے کہ ہر روز نہ سہی ہر دوسرے دن ایک صفحہ بچوں کے لئے مخصوص ہونا چاہئے جس میں صرف بچوں کی دلچسپی کے معلوماتی مضامین شائع ہوں۔ اس میں کارٹون بکثرت ہونے چاہیں۔ اور اس سے شہر کے بچوں میں ''آئینہ'' کی مقبولیت بڑھ جائے گی۔

مدیر ''آئینہ'' کی بیوی کا اصرار ہے کہ ''بزم خواتین'' کے نام سے بھی اگر ایک صفحہ نہیں تو چند کالم ضرور مخصوص کئے جائیں۔ تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ شہر کی تعلیم یافتہ خواتین میں بھی اس اخبار کی اشاعت ہو۔ ادارہ ''آئینہ'' کے ایک سرگرم رُکن اس بات پر بضد ہیں کہ ''آئینہ'' میں فوراً سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے۔ جس میں خطوط کے جواب تو مدیر ''آئینہ'' خود لکھیں گے۔ لیکن شائع یہ کسی خاتون کے فرضی نام سے ہوں گے۔ لیکن ایک تجربہ کار صحافی کا کہنا ہے کہ اس قسم کے کالم ہرگز شائع نہ کرو، کیونکہ اس سے اخبار کا تقدس اور اس کی سنجیدگی متاثر ہوتی ہے۔ بہت سے قارئین کے خیال میں ''آئینہ'' کی طباعت اور کتابت دونوں ہی بہت عمدہ ہیں۔ لیکن بعض اخبار بینوں نے شکایت کی ہے کہ کاتبوں کا خط بہت باریک ہے۔ اسے کچھ موٹا ہونا چاہئے۔ اکثر لوگ اس بات سے خوش ہیں کہ روزنامہ ''آئینہ'' میں مطالعے کا مواد اتنا ہوتا ہے کہ اس میں کم از کم دو گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے احباب کی بھی کمی نہیں کہ جو اتنے سارے مواد کی اشاعت کو اخبار کی

شہرت اور صحت کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح زیادہ اور ثقیل غذا کھانے سے انسان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اسی طرح روزنامے میں اتنا مواد ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جائیگی۔ اور وہ مختصر سے مختصر اخبار کی طرف متوجہ ہوں گے۔

کچھ تاجر دوستوں کی رائے یہ ہے کہ اخبار اتنی تعداد میں شائع ہونا چاہئے کہ ہر شخص کو اس کے دروازے پر اخبار مل جائے۔ لیکن کچھ تجربہ کار دوستوں کے خیال میں اخبار کی اشاعت اس کی مانگ کے مقابلے میں کم ہونا چاہئے تاکہ ہر شخص اس کی تلاش میں مارا مارا پھرے، ان کا کہنا ہے کہ اس سے اخبار کی وقعت اور اہمیت میں اضافہ ہو جائے گا۔

اخبار کے ہاکروں کا مطالبہ ہے کہ ایک تو سنسنی خیز خبر شائع کیجئے اور دوسرا پھس پھس خبروں پر بھی سنسنی خیز سُرخیاں جمایا کیجئے، کاتبوں کا تقاضا یہ ہے کہ شام آٹھ بجے تک اخبار کی کاپی پریس میں بھیج دی جائے۔ اور روزنامے کا منشا یہ ہے کہ رات گئے تک کی خبروں کا خلاصہ اس میں شائع ہونا چاہئے۔ بہت سے لوگ زبانی مبارک بادی کو سالانہ چندے کا نعم البدل سمجھ کر باقاعدگی سے اخبار بھیجنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اخبار میں کام کرنے والے ملازمین تنخواہ میں اضافے کا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کتابت کے سہارے صحافت چلا رہا ہوں، اور بعض ناقدوں کی رائے میں صحافت سے خطابت کا کام لے رہا ہوں۔ غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں اور میں بوڑھے کی طرح یہ سوچ رہا ہوں کہ گھوڑے کو بیچ کر مزے کی نیند سو جاؤں۔

مثال اور کردار:-

پچھلے ہفتے صرف ہماری ریاست ہی نہیں ملک بھر کے مشہور اور مایہ ناز مصور غلام رسول سنتوش کی مصوری کے تازہ ترین نمونوں کی نمائش سرینگر کے ٹیچرس ٹریننگ کالج میں شروع ہوگئی۔ سنتوش صاحب نے یہ نمائش اپنے پیارے دوست اور اُردو کے مشہور افسانہ نگار ٹھاکر پونچھی کے نام سے منسوب کی ہے اور اس کی رسم افتتاح وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھوں انجام دی جانے والی تھی۔ ظاہر ہے کہ شیخ صاحب نے ایک ہفتہ قبل ۶ راگست کو ساڑھے چھ بجے اس تصویری نمائش کا افتتاح کرنا منظور کرلیا تھا اور اس لئے کئی دن پہلے اخبارات میں اس کا اعلان ہوتا رہا۔ اور سنتوش نے دعوتی کارڈوں میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا تھا۔ ۶ تاریخ کو ٹیچرس ٹریننگ کالج میں چھ بجے سے پہلے ہی سنتوش کی مصوری کے عاشقوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ اور ساڑھے چھ بجے تک ٹریننگ کالج کا ہال شایقین سے بھر گیا۔ شہر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب اتنے لوگ تصویروں (اور وہ بھی جدید مصوروں) کی نمائش دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے اور اس میں یقیناً سنتوش کی تصویروں کے علاوہ شیخ صاحب کی شخصیت کا اعجاز بھی شامل تھا۔ بہر حال ساڑھے چھ بجے سے شیخ صاحب کا انتظار شروع ہوا اور سات بجے تک سب لوگ یہی سمجھتے رہے کہ شیخ صاحب کس تقریب میں وقت پر آتے ہیں جو آج کی نمائش میں مقررہ وقت پر آئیں گے۔ لیکن جب سوا سات اور ساڑھے سات بھی بج گئے۔ تو سنتوش کی پریشانی اور شایقین کا اضطراب بڑھنے لگا۔

ٹیلی فون کیئے گئے۔ قاصد دوڑائے گئے اور وزیر اعلیٰ کے سکریٹری سے رابطہ قائم کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وزیر اعلیٰ اسمبلی میں کسی سلیکٹ کمیٹی کی میٹنگ میں مصروف ہیں، اس کے باوجود انتظار ہوتا رہا اور پھر ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہ اطلاع موصول ہوئی کہ شیخ صاحب نمائش کی افتتاح کے لئے نہ آسکیں گے۔ سنتوش کی مایوسی اور شائقین کی محرومی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں کہ جن پر اس قسم کا سانحہ گذرا ہو۔ بہ صد حسرت و یاس سنتوش نے خود اپنی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کیا اور اس طرح خدا خدا کر کے یہ تکلیف دہ شام گذر گئی۔

یہ اگر پہلا موقع ہوتا تو شاید اس کو نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ لیکن قبلہ شیخ صاحب کے لئے یہ بات اب روزمرہ کا معمول بن گئی ہے کہ وہ ہر تقریب میں صرف دیر سے ہی نہیں بہت دیر سے آتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بے حد مصروف ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے لوگ انہیں غیر ضروری مصروفیات میں بھی اُلجھاتے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ وہ اس عمر میں ضرورت سے زیادہ محنت اور مصروفیات کا بوجھ اُٹھاتے ہیں میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ذمہ داریوں اور گونا گوں مصروفیات سے ابھی تک اس کا دم پھول گیا ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وقت کی پابندی اور خاص طور پر ایسی تقاریب میں کہ جہاں سینکڑوں لوگ ان کے انتظار میں بیٹھے ہوں بھی ایک ایسا فرض ہے کہ جسے نبھانا اتنا ہی اہم اور ضروری ہے۔ جتنا دوسرے فرائض...... شیخ صاحب کا کردار ہم سب کے لئے مثال کی

حیثیت رکھتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی مثال ہمارا کردار بن جائے۔

☆

جولائی ۱۹۷۵ء

کس کی ہار کس کی جیت !:-

دو دیہاتیوں کے درمیان عرصہ دراز سے ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ اور اس کی پیروی میں دونوں کا بہت سا وقت اور پیسہ بھی ضائع ہو گیا۔ کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ مقدمے بازی چھوڑ دو، اور باہمی مصالحت کرو، لیکن یہ مسئلہ دونوں کے لئے ناک کا سوال بن گیا تھا۔ اس لئے وہ آخری دم تک مقدمہ لڑنے کی قسمیں کھاتے رہے۔ بالآخر ایک دن عدالت نے ایک فریق کے حق میں فیصلہ صادر کر ہی دیا اور جس کے حق میں فیصلہ ہوا، وہ خوش خوش اپنے گاؤں لوٹا، لیکن اس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی فریق دوم (جس نے مقدمہ ہار دیا تھا) نے اپنے گھر میں کامیابی کا جشن منانا شروع کر دیا، اور سارے گاؤں کے لوگ اسے مبارکباد دینے کے لئے اس کے گھر گئے۔ وہ اس درجہ خوش نظر آ رہا تھا، کہ جیتنے والے دیہاتی کو بھی شک ہو گیا کہ کہیں"

میں نے فیصلہ غلط تو نہیں سنا ہے۔'' ادھر فریق دوم کے ہاں فتح کا جشن بڑے جوش و خروش اور زور شور سے جاری تھا۔ اور بالآخر مقدمہ جیتنے والے دیہاتی کو یقین ہو گیا کہ اس نے مقدمہ ہارا ہے۔ اور اسے عدالت کا فیصلہ سننے میں غلطی ہو گئی ہے۔ اس مرحلے پر وہ بھی اپنے حریف کو مبارک باد دینے کے لئے اس کے گھر گیا۔ اور وہاں دونوں فریق ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔ ہارنے والے دیہاتی نے کہا کہ بھائی! مقدمے میں میری جیت ہوئی تو کیا آخر تم میرے بھائی ہو، عدالت کے فیصلے کو گولی مارو، آؤ آپس میں تصفیہ کر کے ساری جائیداد کو نصف نصف بانٹ لیں۔'' جیتنے والے دیہاتی کو اب تک اپنی ہار کا مکمل یقین ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے حریف کی دریا دلی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے سوچا کہ عدالت میں مقدمہ جیتنے کے باوجود مجھے نصف جائیداد دے رہا ہے۔ یہ کیا کم ہے۔ اس لئے اس نے آنکھیں بند کر کے تصفیہ نامے پر دستخط کر دیئے!

سپریم کورٹ کے جسٹس کرشنا آئر نے مسز اندرا گاندھی کی درخواست التواء پر جو فیصلہ ۲۴ جون کو صادر فرمایا وہ اتنا مبہم اور پیچیدہ تھا کہ عام لوگوں کے لئے یہ طے کرنا مشکل بن گیا کہ فیصلہ مسز گاندھی کے حق میں ہوا ہے یا ان کے خلاف! قانون دان اور مسز اندرا گاندھی کے بہت سے مشیر جانتے تھے کہ جسٹس آئر کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے اس پر اتنی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا کہ بہت سے لوگوں کو جن میں یقیناً مسز گاندھی کے دشمنوں کی اچھی خاصی تعداد بھی شامل تھی، یہ یقین ہو گیا کہ

حکمِ التواء کے لئے مسز گاندھی کی درخواست قبول کرلی گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بہت سے کانگریسی لیڈروں نے مسز گاندھی کو اس "عظیم الشان کامیابی" پر مبارک بادی کے تار بھیجے، اور دلی میں کچھ عمر رسیدہ عورتوں نے فرط مسرت سے شاہراہوں پر بھانگڑہ کرنا شروع کردیا۔ انتہا اس وقت ہوگئی، کہ جب مرکزی وزیر قانون مسٹر گوکھلے نے یہ دعویٰ کیا۔ کہ جسٹس آئر کے فیصلے سے ہمارا مدعا اور موقف پورا ہوگیا ہے۔ اور مسز گاندھی کی قانونی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوگئی ہے تب مجھے دو دیہاتیوں کے اس مقدمے کی روداد یاد آگئی کہ جس میں ہارنے والا خوش اور جیتنے والا پریشان نظر آتا ہے۔

ہنگامی حالات کے ہنگامے:۔

۲۵ جون کی صبح آٹھ بجے میں حسبِ معمول وودھ بھارتی کے فلمی سنگیت سے محظوظ ہو رہا تھا کہ دفعتاً لتا منگیشکر کی بجائے مسز اندرا گاندھی کی آواز سنائی دی۔ شدھ ہندی میں وزیراعظم کا لہجہ بہت گھمبیر، آواز بہت صاف اور الفاظ بہت واضح تھے وہ ملک میں ہنگامی حالات کے نفاذ کا اعلان کر رہی تھیں، اعلان میں صدر جمہوریہ کے اس فرمان کا ذکر رہی تھیں، کہ جو ایک گھنٹہ پہلے راشٹرپتی بھون سے جاری ہوا تھا۔ اور جس کی رُو سے ملک کی اندرونی سلامتی کو خطرہ لاحق ہونے کی بناء پر مرکزی حکومت کو غیر معمولی اختیارات دیئے گئے تھے۔ وزیراعظم اپنی تقریر میں بہت ہی ثقیل ہندی استعمال کر رہی تھیں۔ اس لئے ان کا ہر لفظ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لیکن

ہندی تقریر کے خاتمے پر، انہوں نے انگریزی میں بھی وہی تقریر نشر کی۔ اور تب میری سمجھ میں پوری بات آ گئی۔

اس ملک میں ۱۹۷۱ء سے ایک ایمر جنسی قائم ہے اور اب ایکبار پھر ایک ایمر جنسی کا اعلان ہوا ہے۔ پہلی ایمر جنسی کا تعلق ملک کو بیرونی حملے کے خطرے سے ہے اور تازہ ایمر جنسی کا نفاذ ملک کی اندرونی سلامتی کو پیدا شدہ خطرے کی بناء پر ہوا ہے۔ جو لوگ بیرونی خطرے کے بناء پر بھی ایمر جنسی کے نفاذ کو غیر معین عرصے تک برقرار رکھنے کے خلاف تھے، ان کے لئے ایک نئی ایمر جنسی کا اعلان بہت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ اور خود میری نگاہوں میں بھی صدر جموریہ کا تازہ فرمان بہت افسوسناک بلکہ المناک ہے۔ میری ہی طرح شاید بہت سے لوگ اندرونی سلامتی کے نام پر تازہ ترین ایمر جنسی کے نفاذ پر شاید خوش نہ ہوں۔ لیکن یہ مرحلہ اس کے حسن وقبح اور اس کی ضرورت یا عدم ضرورت پر بحث کرنے کا نہیں ہے۔ قانون کی رو سے ایمر جنسی کے اس اعلان پر مخالفانہ رائے ظاہر کرنا بھی قانون کی خلاف ورزی ہے اور بالخصوص اخبارات کو اس کی نسبت ناپسندیدہ خبریں مخالفانہ ادارے یا کسی طرح کی تنقید شائع کرنے کی سخت ممانعت ہے اس پس منظر میں تازہ ترین حالات کے متعلق ہم سب کو اپنا فیصلہ اور ردِ عمل فی الحال محفوظ رکھنا پڑے گا۔ اور مجھے افسوس ہے کہ نئی دشواریوں کی بناء پر میں اور میرے ہم پیشہ اخبار نویس شاید کچھ عرصے تک اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے قارئین ہماری مجبوریوں اور ہماری

مشکلات کو سمجھ کر ہم سے تعاون کریں گے......اس سلسلے میں اپنے بیان باز لیڈروں اور نادان مولویوں سے بھی یہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہر موضوع اور ہر مسئلے پر اپنی زبان کھولنے کی عادت کچھ دیر کے لئے ترک کر دیں۔ میرا روئے سخن خاص طور پر اپنے نوجوان دوست میر واعظ مولانا محمد فاروق کی طرف ہے کہ جنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایمر جنسی کے نفاذ پر فوراً ہی اپنا شدید ردِ عمل ظاہر کر کے حسب معمول اور حسب سابق ایک عدد بیان اخبارات کے نام جاری فرمایا ہے۔ مولانا کو یقیناً اس بات کا علم نہیں ہوگا، کہ ایسا کرنا ایمر جنسی قوانین کی خلاف ورزی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ اس قسم کی حرکت نہیں کریں گے۔ لیکن اگر انہوں نے پوری علمیت اور آگہی کے باوجود یہ بیان دیا ہے، تو میں ان کی جرأت اور ہمت کی داد دیئے بغیر نہ رہوں گا۔ اور ان سے توقع رکھوں گا کہ پھر وہ صرف اسی بیان پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ زیادہ کھل کر اور واضح الفاظ میں ایمر جنسی کے نفاذ کے متعلق عوام کے سامنے اپنے ردِ عمل اور خیالات کا اظہار کریں گے۔ ایسا کرنے میں انہیں یقیناً بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور شاید جیل کی ہوا بھی کھانا پڑے۔ لیکن جمہوریت کی بحالی اور حق خود ارادیت کی جنگ میں اگر وہ یہ قربانی دینے کے لئے بھی تیار نہ ہوں۔ تو پھر ان کی قیادت کس کام کی!

گوبلز کے شاگرد:۔

گوبلز نے اپنے پیرؤوں کو ہدایت دی تھی کہ اپنے مخالف پر زیادہ

سے زیادہ گند اچھالو۔ تا کہ سب نہیں، تو کچھ گند اس سے چپک ہی جائے۔
گوبلز کو مرے ہوئے آج پورے ۳۰ سال ہو گئے۔ لیکن اس کے شاگردوں
اور اس کے فلسفے پر یقین رکھنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی
ہوتا جا رہا ہے۔ اور اپنے گرو کی تعلیم کو اپنے ایمان کا جزو بنانے والوں میں
بھارتیہ جن سنگھ اور کشمیر کی جماعت اسلامی کے لیڈروں کا نام سرفہرست ہے۔
اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ سفید جھوٹ بولنے کا
سٹیفکیٹ ملنا چاہیے۔ بھارتیہ جن سنگھ اور جماعت (غیر) اسلامی کے بدکردار
اور بداطوار لیڈر پچھلے کئی ماہ سے شیخ صاحب کی ذات پر گند اُچھال کر ان پر
طرح طرح کے الزامات عائد کر رہے ہیں۔ جن سنگھی اخبارات
اور جماعت اسلامی کے اخبار ''ہذیان'' میں بیگم شیخ محمد عبداللہ کے متعلق یہ
جھوٹ اتنی مرتبہ دُہرایا گیا کہ انہیں پندرہ سولہ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مل رہی ہے
کہ بہت سے بھولے بھالے لوگوں کو رفتہ رفتہ اس جھوٹ کی صحت پر یقین
آنے لگا۔ حد یہ ہے کہ مشہور صحافی پریم بھاٹیہ بھی اس پروپگنڈے کا شکار
ہو گئے۔ اور نہوں نے اپنے ہفتہ واری جائزے میں شیخ صاحب کی وکالت
کرتے ہوئے یہ لکھا کہ ''بیگم صاحبہ کو ایک برائے نام مشاہرہ ملتا ہے'' جبکہ
حقیقت یہ ہے کہ بیگم عبداللہ کو سماجی بہبود کے سلسلے میں اپنی خدمات کے لئے
کوئی معاوضہ یا مشاہرہ نہیں ملتا۔ جن سنگھی قاتلوں سے ہمیں کبھی یہ توقع نہیں
تھی کہ حق و صداقت اور انصاف کو قتل کئے بغیر اپنا کھانا ہضم کر سکیں گے۔
لیکن جماعت (غیر) اسلامی کے علمبردار تو صبح سے شام تک اپنی بلند کرداری

،اسلام پسندی، انسان دوستی اور حق پرستی کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں۔انہیں اگر اپنی خاطر نہیں تو اس مذہب سے اپنی نسبت کی خاطر ہی، دورغ گوئی اور دُشنام طرازی سے باز رہنا چاہیے تھا کہ جس مذہب نے حق وصداقت کو ایمان کا پہلا جز اور انسانی نجات کا بنیادی زینہ قرار دیا ہے۔ بیگم صاحبہ کے متعلق اس دردغ گوئی اور بے ایمانی سے کام لے کر وہ اسلامی اور انسانی قدروں کی کون سی آبیاری کر رہے ہیں؟ لیکن اِن اسلام فروش ملاؤں سے حق گوئی اور راست بازی کی توقع ہی فضول ہے یہ لوگ تو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے چادرِ زہرا بیچنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ بیگم عبداللہ بے چاری کس شمار وقطار میں ہیں!

جولائی ۱۹۷۵ء

دہلی کے شب وروز:۔

ملک میں اندرونی ایمر جنسی لاگو ہونے کے بعد پچھلے ہفتے جب میں پہلی بار دہلی گیا۔تو میں نے اپنی توقعات کے برعکس شہر کو خاصا پُر امن اور پُر سکون پایا۔ روز مرہ کا کاروبار بالکل اسی طرح جاری ہے کہ جس طرح ایمر جنسی کے نفاذ سے پہلے تھا۔ ہندوستان کی سیاسی کشمکش سے ناواقف کسی شخص کے لئے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کیا گیا ہے۔خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ملک کی آبادی کے ۹۰ فیصدی حصے کو سیاسی نزاکتوں اور سیاست دانوں کی باہمی رقابتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے ایمر جنسی کے نفاذ سے ان کے روزمرہ کے معمول پر کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔شہر میں رکشا چلانے والے مزدور، فیکٹری میں کام کرنے والے کاریگر، کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور دن بھر بوجھ اُٹھانے والے قلی

کو کیا معلوم کہ ہندوستان کے آئین نے اُسے آزادئ تحریر وتقریر کے بنیادی حقوق دیئے ہیں۔ اسے آزادی کے ۲۸ برسوں میں اپنے پیٹ کی آگ بجھانے سے کہاں فرصت ملی ہے کہ وہ تحریر وتقریر کی اس آزادی کو استعمال کر کے اپنے آزاد ہونے کا لطف اُٹھاتا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ غریب عوام کے نام پر حاصل کی ہوئی اس آزادی کا استعمال بھی زیادہ تر وہی لوگ کرتے تھے کہ جو معاشی لحاظ سے فارغ البال ذہنی طور آسودہ حال اور سماجی اعتبار سے خوش حال تھے۔ اس لئے اس آزادی کے چھن جانے کا غم اور افسوس بھی ان ہی لوگوں کو ہے کہ جو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھانے اُجلے کپڑے پہننے اور سگار پی کر دھواں دھار تقریریں جھاڑا کرتے تھے۔ ان کے لئے تحریر و تقریر کی آزادی ایک تفریح اور ایک عیاشی سے کم نہ تھی، ایمرجنسی کے نفاذ کا ملک بھر میں جو ردِ عمل ہوا ہے، اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جمہوریت اور بنیادی حقوق کی عیاشی سے کم از کم عام آدمی ابھی تک بے بہرہ ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان ''روحانی برکتوں'' کی خاطر اپنے جسمانی وجود کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار ہوگا، فضول ہے۔ اس کے لئے بنیادی مسئلہ ''پیٹ'' ہے اور وہ ہر اُس نظام کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کیلئے تیار ہے کہ جو اس کی زندگی کے عذاب کو کم کر دے! جو اسے دو وقت کی روٹی دینے کا وعدہ کرے اور جو بڑھتی ہوئی قیمتوں کو کم کر کے اس کے فوری مصائب کا مداوا کر سکے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد اسے چونکہ اس کی اُمید پیدا ہوگئی ہے کہ اس کی بگڑی ہوئی دنیا شاید سنور جائے گی اس لئے اس نے

ایک فلسفیانہ خاموشی کے ساتھ، نئی تبدیلیوں اور پابندیوں کو قبول کرلیا ہے! نئی دہلی کے سرکاری حلقے اس بات سے مطمئن ہیں کہ جے پرکاش نرائن اور مخالف جماعتوں کے دوسرے سرکردہ رہنماؤں کی گرفتاری کے باوجود دہلی یا ملک کے کسی دوسرے حصے میں کوئی ہنگامہ بپا نہیں ہوا۔ اور حزب مخالف کے جو لیڈر خون بہانے کی دھمکیاں دے رہے تھے، وہ محض گیدڑ بھبکیاں ثابت ہوئی ہیں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے بیس نکاتی اقتصادی پروگرام پیش کر کے اپنے مخالفوں پر ایک اور بھرپور وار کرلیا ہے اور انہیں بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ ایمرجنسی کا فائدہ اُٹھا کر اس پروگرام کو موثر طور پر رُوبہ عمل لانے میں کامیاب ہوں گی ان کی توقعات کہاں تک صحیح ثابت ہوں گی اس کا فیصلہ تو وقت ہی کرے گا لیکن ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ ان کے اقتصادی پروگرام نے اُمیدوں اور توقعات کی ایک نئی فصل اُگا ئی ہے اور بہت سے لوگ آئندہ چند ماہ کے دوران بڑی دلچسپی سے ان کی کارکردگی کا مطالعہ کریں گے پارلیمنٹ کا مرکزی ہال، جہاں عام طور پر ممبران پارلیمنٹ اور اخبار نویسوں کی گپ شپ سے خاصی گہما گہمی رہتی ہے اب کی بار مجھے کچھ سونا سونا نظر آیا۔ ایک تو لوگ کم نظر آئے اور جو نظر آئے۔ وہ اتنے خاموش، سنجیدہ اور گُم سُم تھے کہ وہاں بیٹھنے کو میرا جی نہیں چاہا۔ ہر شخص سرگوشیوں میں بات کر رہا تھا۔ حزب مخالف میں کمیونسٹ پارٹی (مارکسٹ) کے لیڈر گرفتار نہیں ہوئے ہیں اور ان میں سے کئی دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ کانگریس پارٹی کے ممبران زیادہ تر آپس میں ہی بات چیت کرتے ہیں اور عام طور پر دوسری

جماعت کے ممبروں سے کھل کر بات نہیں کرتے! اب جبکہ ۲۱ تاریخ سے پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہونے کا باقاعدہ اعلان ہو گیا ہے، مرکزی ہال کی رونق میں کئی گنا اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ لیکن اب کی بار پارلیمنٹ کی فضا یقیناً مختلف ہوگی...... پارلیمنٹ کا مون سون سیشن عام طور پر پانچ سے چھ ہفتوں تک جاری رہتا تھا لیکن اب کی بار یہ مشکل سے ایک ہفتے چلے گا!

دہلی میں دو روزہ قیام کے دوران میں کوئلے اور توانائی کے وزیر شری کے۔سی پنت، منصوبہ بندی کے نئے وزیر شری اندر کمار گجرال اور اطلاعات و نشریات کے نئے انچارج منسٹر شری وِدیا چرن شُکلا سے بھی ملا۔ پنت جی سے تو اپنا ایک ذاتی کام تھا اور اس سلسلے میں ان سے مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جب میں صبح نو بجے کے قریب ان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ تو وہ نیکر پہن کر کہیں جا رہے تھے پہلے میں یہ سمجھا کہ شاید ایمرجنسی کے دوران وزیروں کو پتلون یا پاجامہ پہننے کی بجائے نیکر پہننے کی ہدایت کی گئی ہے، لیکن پنت جی نے بتایا کہ وہ دراصل ٹینس کھیلنے جا رہے ہیں!

اندر کمار گجرال کو ہنگامی حالات کا اعلان ہونے کے بعد جس ہنگامی طریقے پر وزارت اطلاعات سے وزارت منصوبہ بندی میں منتقل کر دیا گیا ہے اس پر دلی کے سیاسی اور صحافی حلقوں میں کافی چہ مے گوئیاں ہو رہی ہیں اور میں اصل سبب جاننے کے لئے گجرال صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس موضوع پر بات کرنے کے علاوہ دُنیا کے ہر مسئلے پر بات کی، گجرال صاحب اعلیٰ دل و دماغ کے مالک ہیں اور مسز اندرا گاندھی کی موجودہ کابینہ

میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے وزیر ہیں۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو جس طور مسز گاندھی کی اِمیج بنانے کے لئے استعمال کیا۔ اس کے لئے وہ ایک عرصے سے اپوزیشن کی تنقید اور تنقیص کا مرکز رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اہم مرحلے پر انہیں اس نازک ذمہ واری سے سبکدوش کر کے پلاننگ جیسے خشک اور بے ضرر محکمے کی سربراہی سونپنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے! میں صرف قیاس کر سکتا ہوں، لیکن قیاس اور افواہ میں زیادہ فرق نہیں، اور افواہ پھیلانا آج کل جرم ہے!

وِدیا چرن شُکلا وزارت داخلہ میں وزیر مملکت رہنے کے علاوہ ڈیفنس پروڈکشن اور پلاننگ کے وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ ایک قابل، محنتی اور تجربہ کار سیاست دان ہیں اور انہیں ایک ایسے مرحلے پر وزارت اطلاعات ونشریات کا قلمدان سونپا گیا ہے کہ جب اخبارات کو آزادی اور آزادئ مطلق کا فرق سمجھانا ضروری بن گیا ہے۔ اس منصب اور ذمہ داری کے لئے ان کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ وزیراعظم کو ان پر، اور ان کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے اور یہ اعتماد مجھے مسٹر شُکلا کے چہرے پر اُس وقت نمایاں طور پر جھلکتا نظر آیا کہ جب میں شاستری بھون میں اُن سے ملا۔ شُکلا صاحب نے مجھے بتایا کہ ملک میں ایمرجنسی اس لئے نافذ کی گئی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تاہم ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایمرجنسی کے تحت حکومت کو حاصل ہونے والے اختیارات کا کم سے کم استعمال ہو! ہمارے پاس کچھ ایسی شکایات آئی ہیں کہ بعض لوگ اپنے ذاتی جھگڑوں کو چکانے

کے لئے یہ غیر معمولی اختیارات استعمال کرر ہے ہیں۔ وزیر اعظم نے ایسے لوگوں کے خلاف سخت کاروائی کرنے کی ہدایات جاری کی ہیں۔ انہوں نے مجھے یقین دِلایا کہ اخبارات پر سنسر شپ عائد کرنے کا مقصد ان میں ذمہ واری کا احساس اور توازن پیدا کرنا ہے۔ ایک شام ایک دوست کے ہاں ''ہندوستان ٹائمز'' کے ایڈیٹر مسٹر بی جی ورگیس سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان سے کیا باتیں ہوئیں، ان کی تفصیل اس وقت نہیں، ایمر جنسی کے خاتمے کے بعد سناؤں گا!

آئینہ کے گیارہ سال:۔

''آئینہ'' نے اپنی اشاعت کے گیارہ سال مکمل کر لئے ہیں۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو شائع ہوا تھا۔ اور اس حساب سے اب ''آئینہ'' نے اپنی زندگی کے بارویں سال میں قدم رکھا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ شروع شروع میں ہم اس کی سالگرہ کے موقع پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا کرتے تھے۔ اور اس تقریب کو بڑی دھوم دھام کے ساتھ منایا کرتے تھے۔ ان تقریبات کو شہر کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں ایک غیر معمولی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما اور سر کردہ شہری ان میں شرکت اور شمولیت کو باعث افتخار سمجھتے تھے۔ جوں جوں ''آئینہ'' جوان ہوتا گیا، میری مصروفیات بھی بڑھتی گئیں اور رفتہ رفتہ خصوصی نمبر کی اشاعت اور سالانہ تقریب کے انعقاد کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ دو سال قبل میں نے اعلان کیا تھا کہ ''آئینہ'' کا ایک انتخاب نمبر شائع کرنے کا ارادہ ہے کہ جس

میں گذشتہ دس سال کے دوران شائع شدہ طنزیہ، تنقیدی اور سیاسی مقالات شامل ہوں گے! اس نمبر کی ترتیب کا کام بھی شروع ہوا تھا۔ لیکن چھپائی کے کاغذ کی قیمتوں میں غیر معمولی اور غیر متوقع اضافے کی وجہ سے یہ ''منصوبہ'' تشنہ تکمیل ہے!

گیارہ بارہ سال کا عرصہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوتا چٹکیوں میں گزر جاتا ہے۔ لیکن اُردو کے ایک ہفتہ روزے کا گیارہ سال تک زندہ رہنا، یقیناً ایک غیر معمولی واقعہ ہے اور مجھے اس بات پر فخر بھی ہے اور مسرت بھی کہ اسے باوقار طریقے پر زندہ رکھنے میں میرا حصہ سب سے زیادہ ہے! اس ریاست میں کل ملا کر ایک سو پچیس ہفت روزے شائع ہوتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے اس ریاست اور ملک کی صحافت میں جو مقام اور مرتبہ ''آئینہ'' کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے ہفت روزے کو نصیب نہیں ہے! میرے اس دعویٰ کو اگر خودستائی اور مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ''آئینہ'' نے اُردو صحافت کے کچھ نئے معیار قائم کئے ہیں اور اب بہت سے اخبارات اس کی تقلید کر کے اپنا معیار اور مواد بہتر بنانے کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں............ میں اس رجحان کو ''آئینہ'' کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہوں!

آپ کو یاد ہوگا کہ گذشتہ دس گیارہ سال کے دوران کئی بار ''آئینہ'' کو ہفت روزے کی بجائے روزانہ ''بنانے کی تجویزیں زیر بحث آئیں اور ایک بار تو روزنامہ بنانے کا اعلان بھی شائع ہوا۔ لیکن بہت سنجیدہ اور صائب الرائے

لوگوں کی رائے میں ''آئینہ'' کو روزنامہ بنا کر اس کے موجودہ کردار اور معیار کو برقرار رکھنا ناممکن تھا اور خود میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے ''آئینہ'' کو روزنامے کی شکل میں دیکھنے والے احباب کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اور ان کا اصرار بڑھ رہا ہے کہ ''آئینہ'' بغیر کسی تاخیر کے روزنامے کی شکل میں جلوہ گر ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اگرچہ میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ لیکن میں سنجیدگی سے ایک روزنامہ جاری کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ''آئینہ'' کو ہی روزانہ اخبار میں تبدیل کیا جائے یا نئے نام سے ایک نیا روزنامہ جاری کر دیا جائے، یہ سوال اس وقت میرے زیر غور ہے اور اس ہفتے کے آخر تک اس کا فیصلہ ہو جائیگا۔

اگست ۱۹۷۵ء

مُراعات اور حقوق کی کشمکش:-

پچھلے ہفتے ریاستی اسمبلی میں شیخ صاحب نے اپنے رہنمایانہ اوصاف، جمہوری مزاج، اخلاقی دیانت اور بلندیٔ کردار کے دو غیر معمولی مظاہرے کئے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد، مگر در حقیقت ایک ہی سوچ اور اپروچ کا نتیجہ ہیں، ایک کا تعلق ممبران اسمبلی کی مراعات سے ہے اور دوسرے کا تعلق ایک سرکاری افسر کے حقوق سے، اور مجھے یقین ہے کہ دونوں کا مختصر سا تذکرہ قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

۱۵ر جولائی کو قانون ساز اسمبلی کے سبھی ممبران نے اس حکم کے خلاف بطور احتجاج ایوان میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ کہ جو ۱۴ر جولائی کو جاری ہوا تھا اور جس کی رُو سے ممبران اسمبلی کے سیکریٹریٹ میں داخل ہونے پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ اس احمقانہ حکم پر ممبران کا مشتعل

ہونا بالکل بجا تھا اور میرے نزدیک یہ حکم واضح طور پر ممبران کی مراعات شکنی کے مترادف تھا۔ ممبران نے اپنے احتجاج کو بائیکاٹ کی شکل دے کر اُس وقت تک ایوان میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک وزیر اعلیٰ خو د آ کر ان کی تسلی نہ کریں۔ ساڑھے دس بجے کے قریب جب شیخ صاحب تشریف لائے تو انہیں بتایا گیا کہ سبھی ممبران اسمبلی کی لابی میں دھرنا لگائے بیٹھے، اُن کے منتظر ہیں، وہ سیدھے لابی میں گئے اور ممبران سے درخواست کی کہ وہ اپنی شکایات باقاعدہ ایوان میں داخل ہو کر پیش کریں۔ شیخ صاحب کی اس ''دعوت'' پر ہی آدھی ناراضگی دُور ہو گئی اور پھر جب ایوان میں چند ممبروں نے سیکریٹریٹ میں اُن کے داخلے پر عائد کی گئی توہین آمیز پابندیوں کا ذکر کیا۔ تو شیخ صاحب نے بغیر کسی حجت، تاویل اور تامل کے اس غیر دانش مندانہ، سرکاری حکم کے جاری کیئے جانے پر گہرے افسوس کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر اس ''حکم'' کا کوئی علم نہیں ہے اور اس قسم کا آرڈر یقیناً کچھ سرکاری افسروں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے جاری کر دیا ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ حکم کسی نے بھی جاری کیا ہو۔ آئینی اور اخلاقی ذمہ داری میری ہے، اور میں اس کے لئے پورے ہاؤس سے معافی مانگتا ہوں۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ صحیح ہے کہ سیکریٹریٹ میں عام لوگوں کے داخلے پر اس لئے پابندی عائد کی گئی ہے کہ روزمرہ کے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہونے پائے، لیکن ممبران اسمبلی پر اس پابندی کا اطلاق اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اپنے حلقہ انتخاب کے مسائل

حل کرنے کے لئے سیکریٹریٹ میں داخل ہونا بھی ان کے فرائض میں شامل ہے۔ شیخ صاحب کی غیر مشروط معافی اور ان کے اظہار افسوس نے ماحول کو یکسر بدل دیا اور جن سنگھ کے رشی کمار کوشل کے بغیر سبھی ممبران نے تالیاں بجا بجا کر ان کے انکسار اور تدبر پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ رشی کمار کوشل کا مطالبہ تھا کہ اس حکم کے جاری کرنے والے افسروں کے خلاف تحقیقات کر کے انہیں سزا دینا چاہئے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ ان افسروں کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ مجھے اس ایوان سے معافی مانگنا پڑی اور میں چونکہ ایڈمنسٹریشن کے سربراہ کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ اس لئے معاملہ یہیں ختم ہو جانا چاہئے۔

دوسرے واقعے کا تعلق ڈائریکٹر اطلاعات محمد یوسف ٹینگ کے خلاف مراعت شکنی کی تحریک سے ہے اور اس معاملے میں وزیر اعلیٰ نے بڑی جرأت اور بڑے جوش سے سرکاری افسروں کے حقوق کا دفاع کیا۔ مراعت شکنی کی اس تحریک کی شان نزول یہ ہے کہ ڈائریکٹر اطلاعات نے اپنے ایک ملازم کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں تغافل برتنے کی پاداش میں سرینگر سے اننت ناگ تبدیل کر دیا تھا اور بدقسمتی سے اس ملازم کو خواجہ غلام محمد بٹ ایم ایل اے کی ہمسائیگی کا شرف حاصل ہے۔ اس لئے ۷/ جولائی کو بٹ صاحب نے اسمبلی ہال کے باہر ڈائریکٹر اطلاعات کو اپنے ہمسائے کی تبدیلی کا یہ حکم واپس لینے کے لئے کہا اور ٹینگ صاحب نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہری کی۔ اس پر خواجہ غلام محمد بٹ ایم ایل اے صاحب بہت

برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے بآواز بلند ٹینگ صاحب کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ ٹینگ صاحب کے بیان کے مطابق انہوں نے بٹ صاحب سے کچھ کہے بغیر اپنی راہ لی۔ اور بظاہر معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ دوسرے دن کچھ نہیں ہوا۔ لیکن تیسرے دن بٹ صاحب کو اسمبلی کے ایک آزاد ممبر (جو عقل اور شعور سے بھی آزاد ہیں) عبدالرشید کابلی نے یہ اطلاع دی کہ ڈائریکٹر اطلاعات نے ان کا حکم نہ مان کر انکی مراعت شکنی کی ہے۔ بٹ صاحب نے غالباً پہلی مرتبہ مراعت شکنی کی اصطلاح سنی تھی۔ اس لئے وہ خود تو خاموش رہے۔ لیکن کابلی صاحب نے ایوان میں مراعت شکنی کا معاملہ اُٹھایا۔ سپیکر سمیت سب لوگ حیران تھے کہ جس ممبر کو مراعت شکنی کی شکایت ہے، وہ تو خاموش ہے۔ لیکن ایک اور ممبر اس کی جانب سے واویلا کر رہا ہے۔ سپیکر نے بٹ صاحب کو ہدایت کی کہ انہیں اپنی شکایت تحریری طور پر پیش کرنا چاہیئے۔ اس کے دوسرے دن سرینگر سے شائع ہونے والے دو روز ناموں (سرینگر ٹائمز اور ہمدرد) نے آسمان سر پر اُٹھالیا کہ ڈائریکٹر اطلاعات کے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پیش ہو رہی ہے۔ ان دونوں معاصرین نے بھی غالباً پہلی بار ''مراعت شکنی'' کی اصطلاح سنی تھی۔ اس لئے وہ اس بات پر خوش تھے کہ شاید اس جرم کی پاداش میں ٹینگ صاحب کو قتل کر دیا جائے گا۔ بہر حال دوسرے دن بٹ صاحب نے تحریری طور یہ شکایت کی کہ ڈائریکٹر اطلاعات نے ان کی درخواست کو ٹھکرا کر ان کی بے عزتی کی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس درخواست پر بٹ صاحب کے علاوہ تقریباً دس اور ممبران

نے بھی دستخط کر دیئے۔ دستخط کنندگان میں کابلی صاحب کے علاوہ جن سنگھ کے رشی کمار کوشل، علی محمد نایک، غلام مصطفٰے میر لسجن اور غلام حسن مسعودی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان معزز ممبران اسمبلی میں سے ایک بھی حضرت ۷ر جولائی کے روز موقع واردات پر موجود نہیں تھے، اور یہ معزز ممبران مجھے معاف کریں گے، کہ ان ہی جیسے ذی عزت ممبران نے اپنے کردار اور اطوار سے اسمبلی اور پارلیمنٹ کے مقدس اداروں کی شہرت اور عزت کو پامال کر دیا ہے، خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات یہ ہے سپیکر نے مراعت شکنی کی تحریک پر اپنا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے اس سلسلے میں مزید تحقیقات کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے ساتھ ہی وزیر اعلیٰ کو مطلع کر دیا کہ ان کے ایک افسر کے خلاف ایک معزز ممبر کی مراعت شکنی کا الزام ہے اور وہ متعلقہ سرکاری افسر سے پوچھ گچھ کر کے انہیں اس کے (version) سے آگاہ کریں۔

۱۷ر جولائی کو جب علی محمد نائیک، رشی کمار کوشل اور کابلی صاحب نے دوبارہ یہ مسئلہ اُٹھایا، تو شیخ صاحب نے براہ راست مداخلت کر کے پانسہ پلٹ دیا۔ علی محمد نائیک نے قواعد وضوابط کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سپیکر کو حکومت سے اس بارے میں استفسار کرنے کا کوئی حق نہیں اور اسے خود یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آیا اس معاملے کو مراعتی کمیٹی کے سپرد کیا جائے یا نہیں، عبدالرشید کابلی کا خیال تھا کہ ممبر اسمبلی کے بیان کو آسمانی صحیفے کی طرح حرفِ حق مان کر افسر کے خلاف کاروائی کی جانی چاہیئے۔ شیخ

صاحب نے آئینی نکتہ اُبھارتے ہوئے کہا کہ "سپیکر صرف ایک ہی فریق کا بیان سن کر اپنا فیصلہ صادر نہیں کرسکتا۔ بلکہ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے اسے لازماً دوسرے فریق کو سننا پڑے گا۔ اور دوسرا فریق چونکہ ایک سرکاری افسر ہے، جو خود ایوان میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش نہیں کرسکتا۔ اس لئے اس کا (Version) جاننے کے لئے سپیکر کا حکومت کی طرف رجوع کرنا انصاف کے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ وزیر اعلیٰ کی اس وضاحت کے بعد بھی جب غلام محمد بٹ کے وکیلوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ڈائریکٹر اطلاعات کے خلاف مراعت شکنی کی تحریک کو فوراً مراعتی کمیٹی کے سپرد کرنا چاہئے تو شیخ صاحب نے پورے جلال میں آکر باآواز بلند ممبران کو خبردار کیا، کہ یہ ناممکن ہے کہ محض چند ممبروں کی شکایت کی بنیاد پر کسی افسر کی گردن کاٹ دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح معزز ممبران کی عزت وقار کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح سرکاری افسروں کے حقوق اور ان کی عزت وآبرو کے تحفظ کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد ہوتی ہے اور کسی ممبر کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ کہ اسے اپنی پوزیشن یا اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرکے سرکاری افسروں کو مرعوب یا متاثر کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ انہوں نے اپنی آواز کو اور بلند کرکے کہا کہ "آنریبل ممبر غلام محمد بٹ کو ایک سرکاری ملازم کا تبادلہ روکنے کے لئے ڈائریکٹر اطلاعات پر دباؤ ڈالنے کا کوئی اخلاقی یا آئینی حق نہیں تھا۔ انہیں اگر کوئی شکایت تھی، تو وہ براہ راست میرے پاس آسکتے تھے۔ اس طرح اگر ہر ممبر

سرکاری کام میں مداخلت کرتا پھرے تو پھر ہمارے لئے ایڈمنسٹریشن چلانا ممکن نہیں ہوگا اور جب تک میرے کندھوں پر ایڈمنسٹریشن چلانے کی ذمہ داریاں ہیں۔ میں ہرگز ہرگز اس قسم کی مداخلت برداشت نہیں کروں گا۔ میں اس ایوان کی اور اس کے سبھی ممبران کی عزت کرتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ جب دو دن پہلے مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ چند سرکاری افسروں نے ایک غیر دانشمندانہ حکم جاری کر کے ان کی توہین کی ہے۔ تو میں نے بغیر کسی تامل کے بھرے ایوان میں معافی مانگی۔ لیکن آج صورت دوسری ہے۔ آج ایک افسر کی عزت اور اس کے حقوق کا سوال ہے اور میں اسے ہر قیمت پر تحفظ دوں گا۔ اور صرف کچھ ممبروں کے چیخنے چلانے کی وجہ سے اسے قتل گاہ میں پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اگر ممبران یہی چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کی تحقیقات ہو تو میں پورے ہاؤس میں اس پر بحث کرنے کے لئے تیار ہوں اور اس سازش اور سکیم کو بے نقاب کر دوں گا۔ جو اس معاملے کے پیچھے کارفرما ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جس ممبر کو مراعت شکنی کی شکایت ہے۔ وہ خود خاموش ہے۔ لیکن ان کے طرف سے کچھ دوسرے ممبران اس معاملے کو اُچھال رہے ہیں اس مرحلے پر سید میر قاسم نے مدعی سست گواہ چست کا فقرہ کسا، اور بٹ صاحب ان چار دنوں میں پہلی بار اپنا موقف بیان کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مراعت شکنی کے بارے میں کچھ نہیں کہا (غالباً انہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا) بلکہ شیخ صاحب کی قیادت پر مکمل اعتماد اور اعتقاد کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ......"میں نے

ہمیشہ ایک سورج کی پرستش کی ہے اور وہ ہے شیر کشمیر کا سورج میں اَن پڑھ ضرور ہوں۔ لیکن مان سنگھ اور بھوپت نہیں۔ میں خوشامدی او چاپلوس نہیں ہوں۔ میرا لیڈر شیر کشمیر جو فیصلہ کرے گا۔ مجھے منظور ہوگا''۔

اس پر شیخ صاحب نے کہا کہ اگر واقعی انہیں میری قیادت اور مجھ پر اعتماد ہوتا۔ تو وہ افسر مذکور کے خلاف اپنی شکایات ایوان میں پیش کرنے کی بجائے میرے پاس آتے، اور میں خود تحقیقات کر کے ان کی شکایت کا ازالہ کرسکتا تھا انہوں نے بٹ صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ملازموں کی تبدیلی اور ترقی کے معاملات کو لے کر افسروں کو مرعوب یا متاثر کرنے کی کوشش نہ کیا کریں۔

شیخ صاحب کی پُر جوش، مدلل اور واضح تقریر نے ایوان پر سناٹے کی سی کیفیت طاری کردی اور ڈائریکٹر اطلاعات محمد یوسف ٹینگ کا سر چاہنے والے ندامت سے اپنا سر جھکا کر ایوان سے باہر آئے، ان کے چہروں پر شکست و ہزیمت کے آثار نمایاں تھے۔ اِدھر سرکاری افسر اس بات پر بے حد خوش نظر آرہے تھے کہ شیخ صاحب نے بغیر لگی لپٹی کے ممبران اسمبلی کو اپنے اقتدار و اختیار کی حدود سمجھائی ہیں اور افسروں کے حقوق کی بڑی جرأت اور جواں مردی کے ساتھ مدافعت کی ہے۔

استعفیٰ اور انتخابات:۔

اس بات پر شاید کسی کو حیرت نہ ہو کہ سرینگر میونسپل کمیٹی کے صدر جی، علی محمد اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے ہیں، ہاں اِس بات پر بہت لوگوں کو

تعجب ضرور تھا کہ وہ اس عہدے پر پچھلے تین سال سے فائز کیوں تھے؟ وہ اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ جہاں عام طور پر لوگ دنیاداری سے کنارہ کش ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جی علی محمد بے حد شریف، سادہ مزاج اور نیک خصلت آدمی ہیں۔ لیکن یہ سارے اوصاف انہیں ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر بنانے کے لئے کافی ثابت نہیں ہوئے۔ اور ان کے دورِ حکومت میں سرینگر میونسپل کمیٹی اپنی کارکردگی اور افادیت کا کوئی ثبوت بہم نہیں کر سکی۔

میونسپل کمیٹی کے نئے صدر جی ایم باون ایک نوجوان وکیل، سرگرم سیاسی شخصیت اور ایک پُر جوش دانشور ہیں۔ ان سے بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ سرینگر میونسپلٹی کو ایک فعال، متحرک اور موثر ادارہ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ باون صاحب کا اتفاق رائے سے بلدیہ کا صدر منتخب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے بزرگ اب نوجوانوں کو ذمہ داریاں سونپنے میں کسی قسم کے بخل یا تامل سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ بعض منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے تجربے سے زیادہ قوتِ عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ باون صاحب کا انتخاب میرے لئے اس لئے بھی باعث مسرت ہے کہ وہ میرے بہت عزیز دوست ہونے کے علاوہ ''آئینہ'' سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔ اور میں ان کی ذہانت کے ساتھ ساتھ ان کی دیانت کا بھی قائل ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ سرینگر میونسپلٹی کے گندخانے میں بھی وہ اپنی شخصیت کا بانکپن اور

اپنے ضمیر کی صفائی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔

☆

۱۹۷۵ء

(مراعت شکنی کی تحریکیں)

سید حسین بنام افتخار حسین :-

۱۴راگست کو قانون ساز کونسل کے چیئرمین سید حسین نے ''آئینہ'' کے خلاف کونسل کے نامزد ممبر مولوی افتخار حسین انصاری کی طرف سے پیش کردہ مراعت شکنی کی وہ تحریک رد کر دی ۔ جو ہفت روزہ ''آئینہ'' کی ۱۵رجولائی کی اشاعت میں شائع شدہ شذرے کے بناء پر پیش ہوئی تھی۔ کہ جس میں ممبران اسمبلی کی نسبت مبینہ طور آبرو ریزی ''بھوپت'' اور'' مان سنگھ'' جیسے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ مولوی صاحب کے خیال میں ممبران کے تئیں آبروریزی کا لفظ انتہائی ہتک آمیز اور قابل اعتراض ہے۔ اور بقول ان کے اس لفظ کے استعمال سے ان کی اور دوسرے ممبران اسمبلی کی توہین ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ مولوی صاحب کا مبلغ علم بہت محدود ہے اور انہوں نے آبروریزی کو صرف ان ہی معنوں میں سمجھا ہے کہ جن معنوں میں افتخار

صاحب جیسے فتویٰ باز اور تعویذ نویس مولوی اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے عربی فارسی لُغت کی بہت سی کتابیں پڑھی ہوں گی۔ لیکن اگر صرف لُغت پڑھنے سے ہی کوئی شخص عالم فاضل بن سکتا تو مولوی افتخار صاحب چار پیسے کمانے کے لئے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر کونسل کی نامزد ممبری کی جستجو میں در بدر نہ پھرتے۔ بلکہ اپنے علم وفضل کی بنیاد پر مسلمانوں کی بالعموم اور شیعہ برادری کی بالخصوص رہنمائی کرتے، بہر کیف، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں ذکر کر رہا تھا۔ اس مراعت شکنی کی تحریک کا، جو افتخار حسین نے پیش کی تھی۔ اور جسے سید حسین نے رد کر دیا، ریاستی اسمبلی کے پڑھے لکھے جاہل کے عنوان سے شائع شدہ اس شذرے کا تعلق قانون ساز کونسل سے نہیں۔ قانون ساز اسمبلی کے ممبران سے تھا۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے خلاف اسمبلی کے کسی ممبر نے مراعت شکنی کی تحریک کا نوٹس نہیں دیا۔ مگر قانون ساز کونسل کے ایک نامزد ممبر (مولوی افتخار حسین) نے آسمان سر پر اُٹھایا کہ ''آئینہ'' میں شائع شدہ اس شذرے سے ان کی آبروریزی ہوئی ہے۔ اس لئے مدیر ''آئینہ'' کو مراعت شکنی کے الزام میں سزا دی جائے۔ کونسل کے چیئرمین سید حسین نے گواہ کی اس چستی اور ''مدعی کی سستی'' پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے مولوی صاحب کو یہ مشورہ دیا ہے، کہ وہ معقولات میں دخل دینے سے اجتناب کیا کریں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ افتخار صاحب اپنے خاندانی وقار اور روایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی زیادہ تر توجہ مذہبی معاملات کی طرف دیا کریں۔ اور باوجود اس کے منسٹری کی

ہوس میں انہوں نے جوں توں کر کے قانون ساز کونسل کی رکنیت حاصل کر لی ہے۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ سیاست ان کے بس کا روگ نہیں...... ان کی اس ساری دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدیر ''آئینہ'' کے خلاف مراعت شکنی ثابت نہ ہو سکی۔ اور اس سے یقیناً ان کی دل شکنی اور حوصلہ شکنی ہوئی ہوگی!

پرکاش ویر شاستری بنام شمیم احمد شمیم :-

یہ تیسرا موقع ہے، کہ جب پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلی کے کچھ نازک مزاجوں نے میرے خلاف مراعت شکنی کی تحریکیں پیش کر کے مجھے مرعوب کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ پہلی بار اگست ۱۹۶۶ء میں لوک سبھا کے اس وقت کے آزاد ممبر پرکاش ویر شاستری نے ''آئینہ'' کی پندرہ اگست ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع شدہ اس اداریے کی بنیاد پر میرے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پیش کر دی۔ کہ جس کا عنوان تھا۔ ''یہ نہیں ہوگا''...... اس ''قابل اعتراض'' اداریے کی شانِ نزول یہ تھی کہ پارلیمنٹ میں کچھ ممبران نے ''نیا کشمیر'' کے تعلیمی نصاب میں شامل ہونے پر سخت ہنگامہ برپا کرتے ہوئے اِسے ملک کی خودمختاری کے منافی قرار دیا تھا۔ اور خود لوک سبھا کے اسپیکر سردار حکم سنگھ نے ان خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ ''اس قسم کی دستاویزات کو تعلیمی نصاب میں شامل کئے جانے سے بچوں کے ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے''...... میں نے ممبران پارلیمنٹ کی اس تنگ نظری اور لاعلمی پر شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے کچھ سخت قسم کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ پرکاش ویر شاستری کی نگاہوں میں جو فقرہ ممبران پارلیمنٹ کی

مراعت شکنی کے زمرے میں آتا ہے وہ یہ تھا۔ ''ہماری نئی نسل بعض ممبران پارلیمنٹ کی طرح جاہل نہیں رہ سکتی اور جہالت کو قومیت کا معیار بنانے کی ہر کوشش کو ناکام بنانا چاہیے!''

لوک سبھا نے اتفاق رائے سے میرے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پارلیمنٹ کی مراعتی کمیٹی کو سُپرد کردی اور کمیٹی نے ۲ستمبر کو میرے خلاف نوٹس جاری کردیا۔ دوسرے دن راجیہ سبھا میں بھی میرے خلاف مراعت شکنی کی تحریک پیش ہوئی!

میں نے لوک سبھا کے نوٹس کے جواب میں تحریری طور ایک مفصل اور جامع وضاحتی بیان بھیج دیا۔ جس میں، میں نے بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ اپنا موقف دہرایا، کہ ''نیا کشمیر'' ہماری تحریک آزادی اور جنگ آزادی کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ اور ہم اس کی شان میں کسی قسم کی گستاخی برداشت نہیں کرسکتے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صادق صاحب مرحوم اور آنجہانی درگا پرشادر، دونوں نے اس موقع پر میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اور مجھے اطمینان دِلایا کہ لوک سبھا کے ساتھ اس معاملے پر تصادم کی صورت میں ان کی تمام تر ہمدردیاں اور عملی اعانت میرے ساتھ ہوگا۔ صادق صاحب نے قابلِ اعتراض اداریہ ''نہیں ہوگا'' پر اپنا ردِعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا۔ کہ آپ نے میرے دل کی بات کہی ہے، اور میں اس کے لئے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں...... ''دو ایک ماہ کے بعد راجیہ سبھا کی مراعتی کمیٹی نے یہ فیصلہ صادر کردیا کہ ممبران پارلیمنٹ کو جاہل کہنا مراعت شکنی کے زمرے

میں نہیں آتا۔ کیوں کہ جاہل کے معنی ہیں۔ Ignorant اس کے چند دن بعد لوک سبھا نے یہ معاملہ چھوڑ دیا اور اس طرح مقدمے میں، میرے مخالفوں کی ہار اور میری جیت ہوئی۔

شری فوطیدار کی سعی ناکام:-

ٹھیک ایک سال بعد ''آئینہ'' کی ۵/اگست ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں ''ممبران اسمبلی کے نام'' سے شائع شدہ میرے ایک اداریہ کے خلاف ریاستی اسمبلی کے ایک کانگریسی ممبر مکھن لال فوطیدار نے مراعت شکنی کی تحریک پیش کردی۔ اس اداریہ میں، میں نے عام انتخابات میں حکمران جماعت اور کانگریسی ممبران اسمبلی کی دھاندلیوں کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سید میر قاسم اور ڈی۔ پی۔ در کے تنخواہ دار ملازم قرار دیا تھا۔ مراعت شکنی کی اس تحریک پر بڑی لے دے ہوئی۔ اور ایک بار جب خواجہ شمس الدین کی صدارت میں قائم کی گئی مراعتی کمیٹی نے مجھے طلب کیا، تو خواجہ شمس الدین اور پنڈت ترلوچن دت کے ساتھ میرے سوال و جواب کا سلسلہ اتنا تلخ ہوگیا کہ بعض ماہرین مراعات کی رائے میں، میں اپنی شہادت کے دوران ایک نہیں کئی مراعات شکنیوں کا مرتکب ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ سرگباشی پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ بھی اس مراعتی کمیٹی کے ممبر تھے۔ اور وہ کانگریسی ممبران کمیٹی کے ساتھ میری تلوار بازی کا خوب مزہ لیتے رہے۔ چند ہفتوں بعد جموں میں ہونے والے اجلاس کے دوران مراعتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کردی کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ سفارش کی تھی کہ مجھے مراعت شکنی کے الزام میں ایوان سے چھ

ہفتے تک کے لئے خارج کر دیا جائے۔ مطلب صاف تھا اور وہ یہ کہ اگر ایوان یہ سفارش منظور کر دے، تو میں چھ ماہ کے بعد اسمبلی کی رُکنیت کے نا اہل قرار پاؤں گا اور اس طرح نہ سر رہے گا نہ دردِ سر!

ریاستی اسمبلی کے اس فیصلے کے خلاف میں نے ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ لیکن رٹ کا فیصلہ ہونے سے پہلے ہی صادق صاحب مرحوم کو یہ اندازہ ہو گیا۔ کہ اس سفارش کا مقصد مجھے ایوان کی رُکنیت سے محروم کرنا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس سفارش کو منظور کرنے کی بجائے اسے واپس مراعتی کمیٹی کو بھیج دیا۔ کہ وہ اس پر دوبارہ غور کرے۔ ایوان نے کثرت رائے سے ان کی تجویز کو قبول کر لیا۔ مگر مراعتی کمیٹی کے ممبران خواجہ شمس الدین اور پنڈت ترلوچن دت بطور احتجاج کمیٹی سے مستعفی ہو گئے...... اس کے چند ماہ بعد نئی مراعتی کمیٹی نے مراعت شکنی کے اس الزام کو پارلیمانی اصطلاح میں Drop کر دیا۔ اور میں ایک بار پھر معرکہ جیت گیا۔

مولوی افتخار صاحب نے اگر غصے میں آکر اپنے پیشروؤں کے انجام سے آگاہی حاصل کی ہوتی۔ تو ان کا انجام یقیناً عبرت ناک نہ ہوا ہوتا۔

کرشنا مینن:-

یہ غالباً ستمبر ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے بنگلہ دیش کی لڑائی جاری تھی۔ اور پارلیمنٹ میں اسی موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں تقریر کر چکا تھا یا کرنے والا تھا، لیکن کرشنا مینن تقریر کر چکے تھے۔ اور وہ میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سرگوشیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے

ہوئے دوسرے ممبران کی تقریروں پر رواں تبصرہ کرر ہے تھے۔ میں نے دفعتاً سلسلہ کلام منقطع کرتے ہوئے کرشنا مینن سے کہا کہ ''آج ہم بنگلہ دیش کے لیڈروں کو خراج تحسین پیش کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ کیا آپ کسی ایسی صورت حال کا تصور کر سکتے ہیں کہ جہاں اسی ایوان میں بیٹھ کر ہم اِن پر تبصرہ پڑھیں گے؟ کرشنا مینن نے ایک لمحے کا توقف کئے بغیر جواب دیا۔ ''یہ بات ممکن ہی نہیں، تقریباً یقینی ہے۔'' کرشنا مینن کو مرے ہوئے آج دو سال ہوگئے، وہ بہت ذہین بے حد ذکی الحس اور ایک اعلیٰ پائے کے سیاستدان تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی اور خامی ان کی حد سے بڑھی ہوئی بے باکی اور صاف گوئی تھی ۔ اُنہوں نے اپنی صاف گوئی سے ساری مغربی دُنیا کو ناراض کر دیا تھا...... اب ایسے صاف گو اور بے باک سیاستدان چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ۔

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا!

اگست ۱۹۷۵ء

غلام نبی طوری:-

غلام نبی طوری کی موت میرے لئے ایک نہایت ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک تجربہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس کی موت میرے لئے ایک غیر متوقع حادثہ تھا۔ بلکہ اس لئے کہ میں پچھلے چھ ماہ سے اس کی موت کا انتظار کر رہا تھا۔ چھ ماہ قبل مجھے ڈاکٹروں نے اعتماد میں لے کر بتادیا تھا کہ طوری زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہیں گے۔ لیکن میں آخری وقت تک اسے یہ تسلیاں دیتا رہا کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے اور وہ جلد ہی صحت یاب ہوکر اپنے روزمرہ کے معمولات شروع کرنے کے اہل ہوجائیگا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ میری جھوٹی تسلیوں کا اس پر کیا ردعمل ہوتا تھا۔ لیکن میری روز کی غلط بیانیوں سے کم از کم طوری صاحب کے بیوی بچوں اور ان کے بزرگ باپ کو یہ اُمید پیدا ہوگئی تھی کہ وہ جلد ہی صحت یاب ہوں گے۔ میں تن تنہا چھ ماہ تک اپنے سینے میں اس راز کو چھپائے رہا۔ اور بالآخر جب ۲۶/جولائی کو طوری

صاحب نے اپنی جان آفرین، ملک الموت کے سپرد کردی۔ تو میرے سینے سے جیسے منوں بوجھ اُتر گیا۔

غلام نبی ضلع اننت ناگ کے ایک دیہات نما قصبے بجبہاڑہ کی پیداوار تھے۔ لیکن ان سے مل کر کسی کو ان کے دیہاتی پس منظر یا خاندانی قدامت پسندی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میری ان سے پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی کہ جب میں ریاستی محکمہ اطلاعات کی طرف سے شائع ہونے والے ماہنامہ "تعمیر" کا مدیر مقرر ہوا۔ طوری صاحب مجھ سے پہلے محکمے میں شامل ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی قابلیت اور اہلیت کی دھاک بٹھا دی تھی۔ ان کی شخصیت میں بظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جو کسی نو وارد کو ان کی طرف متوجہ کرتی۔ اس لئے کچھ دنوں تک ہم ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ لیکن جب کچھ دن بعد ان سے شناسائی ہوئی۔ تو مجھے ان کی ذہانت فطانت اور صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ وہ بہت ہی شگفتہ مزاج، تیز طرار اور ہوشیار آدمی تھے اور انہوں نے خالص اپنی محنت اور قابلیت سے نہ صرف محکمہ اطلاعات میں بلکہ شہر کی مجلسی اور سماجی زندگی میں بھی اپنی شخصیت کا لوہا منوایا تھا۔ اگر محکمہ اطلاعات کے بہت سے افسر اور اہلکار مجھ سے ناراض نہ ہو جائیں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ قابلیت، دوست داری، رکھ کھاؤ اور خوش مزاجی کے اعتبار سے اس محکمے میں کوئی ان کی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ اُن کا شمار ان معدودے چند دیہاتی نوجوانوں میں ہوتا ہے کہ جو کسی احساس کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر شہر کے دانشوروں سے عام طور پر برابر کی سطح اور کبھی کبھی اونچی

سطح سے بات کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ جس پسماندہ گھریلو اور سماجی ماحول سے ان کا تعلق تھا، اس کے پیش نظر طوری کی خود اعتمادی اور روشن دماغی ایک معجزے سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہ اس کی بڑی بد قسمتی تھی کہ وہ سیاست کی بجائے سرکاری ملازمت کی محدود اور تنگ و تاریک دنیا میں اُلجھ کر رہ گیا۔ کیونکہ اس کا ذہن اس کی طبیعت اور اس کا مزاج بنیادی طور پر سیاست کے لئے موزون تھا۔ اور واقعہ ہے کہ طوری صاحب کی صحبت اور تربیت سے کئی بھولے بھالے دیہاتیوں کو سیاست کے اونچے اونچے ایوانوں تک رسائی حاصل ہوگئی!

طوری بہت Ambitious تھے اور انہیں اس بات کا احساس تھا کہ سرکاری ملازمت کی تنگنائے ان کی وسعت بیان کے لئے کافی نہیں۔ لیکن سرکاری ملازمت کے تحفظات انسان کو بزدل بنادیتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی شدید خواہش کے باوجود بھی اس دنیا سے باہر نہیں آسکے۔ وہ ایڈیٹر سے کلچرل آفیسر، پھر انفارمیشن آفیسر، اس کے بعد اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور آخر میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہوگئے تھے اور اب جبکہ ان کے عروج کی بہت سی راہیں نکل آئی تھیں۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوگئے۔

طوری کی موت کے ڈرامے میں بھی ایک عجیب سسپنس پایا جاتا ہے۔ وہ اتنے ہٹے کٹے اور موٹے تازے نوجوان تھے کہ اُن کی صحت پر ان کے اکثر دوستوں کو رشک آتا تھا اور کم از کم میں نے اس کی زبان سے کبھی سردرد کی معمولی شکایت بھی نہیں سنی ہے۔ وہ خوب کھاتا تھا اور اس کے دوست اسے

اکثر یہ کہہ کر چڑایا کرتے تھے کہ تم خورد ونوش کے اعتبار سے صرف کامریڈ موتی لال مصری سے ہی مات کھا سکتے ہو۔'' طوری اپنی زندہ دلی اور خوش اخلاقی سے ہر مذاق کو مذاق میں ٹال کر اپنی شکم پری میں مصروف رہتا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں ہمیشہ فولاد کا تصور آتا۔ اور پھر پچھلے سال نومبر میں اس کی بیوی بیمار ہوگئی۔ جموں ٹی بی ہسپتال کے ڈاکٹر زتشی نے مسز طوری کا معائینہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ انہیں ٹی بی ہوگئی ہے اور احتیاط کے طور پر انہوں نے سارے کنبے کا ایکسرے کرنے کا مشورہ دیا۔ جب پورے گھرانے کا ایکسرے ہوا تو طوری کے پھیپھڑے پر ایک منحوس سایہ دکھائی دیا۔ یہ کینسر کے موذی اور نا قابل علاج مرض کا سایہ تھا۔ اس کے بعد دلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں ہندوستان کے سب سے بڑے تھورسیک (Thoracic) سرجن ڈاکٹر گوپی ناتھ نے طوری کی زندگی بچانے کے لئے اس جنگ کا آغاز کیا۔ کہ جو ٹھیک سات مہینے تک جاری رہنے کے بعد ۲۶ جولائی کو طوری صاحب کے آبائی گاؤں بجبہاڑہ میں اختتام کو پہنچ گئی۔ جنوری کے مہینے میں جب ان کا ایک پھیپھڑا کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ تو کچھ دنوں کے بعد یہ اُمید پیدا ہوگئی تھی کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو کر زندہ رہیں گے۔ لیکن ہمارا اندازہ اور ڈاکٹر گوپی ناتھ کا یقین غلط ثابت ہو گیا اور زندگی سے بے پناہ محبت کرنے والا میرا دوست طوری زندگی کو داغ مفارقت دے کر چلا گیا۔

طوری کے اس تذکرے میں دو شخصیتوں کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ایک ڈاکٹر گوپی ناتھ کا اور دوسرا طوری کے ایک بہت قریبی دوست موتی لال مصری کا ڈاکٹر گوپی ناتھ نے مرحوم کے علاج میں جس دلچسپی ، ایکسوئی اور لگن کا مظاہرہ کیا۔ وہ شاید صرف ایک باپ اپنے بیٹے یا ایک بھائی اپنے بھائی کے لیئے ہی کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس مصری صاحب طوری کے ہم نوالہ وہم پیالہ تھے وہ ان کی تندرستی کے دنوں میں ان کی مہمان نوازی اور خاطرداری سے جی بھر کر مستفید ہوتے رہے۔ لیکن اپنے مہمان نواز دوست کی بیماری سے لے کر ان کی موت کے چھ ماہ کے دوران مصری صاحب نے ایک بار بھی اپنے دوست کی خبر نہیں لی۔ میں سوچتا ہوں کہ انسان کتنا بے رحم اور سنگ دل ہوسکتا ہے۔ لیکن پھر ڈاکٹر گوپی ناتھ کی محبت اور ڈاکٹر طاہر مرزا کا التفات یاد آجاتا ہے اور انسانیت پر میرا متزلزل اعتقاد بحال ہوجاتا ہے۔ طوری بڑے دوست نواز اور دل نواز دوست تھے، خدا ان کے دوستوں کو بھی دوستی کا سلیقہ عطا کرے۔

ضمیر کی پارلیمنٹ :-

پارلیمنٹ کے موجودہ ہنگامی اجلاس میں میری شرکت ایک نادر تجربہ تھا اور یقین جانئے کہ میں دہلی جانے سے پہلے ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ سوال یہ تھا کہ بدلے ہوئے ماحول میں دل کی بات سنی جائے یا دماغ کی، دوست احباب اور بہی خواہوں نے مشورہ دیا تھا کہ وہی کرو جو ہر سمجھدار، دنیادار اور عاقبت اندیش کو کرنا چاہیئے۔ کچھ لوگوں نے میری جوانی پر رحم کھا کر مجھے حد درجہ محتاط رہنے کی نصیحت کی تھی اور بعض بزرگوں نے یہ

سمجھا دیا تھا کہ کچھ نہ کہو اور خاموشی سے سب کچھ سنتے رہو۔ پند ونصائح کا یہ سارا بوجھ اپنے ذہن پر لاد کر جب میں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دلی کے لئے روانہ ہوا تو میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہی کروں گا۔ جو آج تک کرتا آیا ہوں۔

پارلیمنٹ کی فضا بھی بدلی ہوئی تھی۔ سنٹرل ہال کے رنگ ڈھنگ بھی کچھ اور تھے، کچھ مانوس چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے اور بہت سے مانوس چہرے بھی کچھ اجنبی سے لگ رہے تھے۔ پھر پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہوا۔ اور میں نے وہی کیا اور کہا کہ جس کی میرے ضمیر نے گواہی دی۔ ریڈیو اور اخبارات پر صرف یہ خبر نشر ہوئی کہ میں نے قراردادوں کی مخالفت کی۔ میں نے کیا کچھ کہا یہ دُہرانے کا اس وقت موقع اور محل نہیں۔ صرف اتنی سی بات کہوں گا کہ میں نے جو کچھ کہا۔ اس سے حزب مخالف اور حکومت دونوں شکایت کا موقع مل گیا۔ میں تو اقبال کے اس شعر کی تفسیر بن کر رہ گیا ہوں ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ہم کیا ''نہیں'' کریں گے:۔

''آئینہ'' کے روزنامہ ہوجانے سے جہاں اس اخبار کے ہزاروں قارئین کو بے حد مسرت وشادمانی ہوئی ہے، وہاں اس کے حریفوں کو کسی حد تک بجا طور اور بہت حد تک غیر ضروری پریشانی لاحق ہورہی ہے اور وہ کسی نہ

کسی طرح اپنی بے چینی اور ناخوشی کا اظہار کررہے ہیں۔ مجھے اپنے ان معاصر حریفوں سے ہمدردی ہے اور میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ''آئینہ'' نہ کسی معاصر کے جواب میں اور نہ کسی مخالف کے خلاف شائع ہورہا ہے۔اس کے سامنے ایک مقصد ایک منزل اور ایک مشن ہے اور وہ کسی کی تردید یا تکذیب میں اپنے صفحات ضائع نہیں کرے گا۔ ہر اخبار کی اپنی ایک روش، اپنا ایک انداز ہوتا ہے اور ''آئینہ'' کا انداز چونکہ دوسروں سے مختلف ہے اور مختلف رہے گا۔ اس لئے کسی صاحب کو غیر ضروری طور پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے بہت سے دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ روزنامہ ''آئینہ'' دوسرے روزناموں سے کس لحاظ سے اور کن معنوں میں مختلف ہوگا۔ میرے لئے اس سوال کا جواب دینا قدرے مشکل ہے۔ میں آپ کو اس مرحلے پر یہ بتانے کے قابل نہیں ہوں کہ ''آئینہ'' میں کیا کچھ ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ کو اس اخبار کے باقاعدہ مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔ لیکن ''آئینہ'' میں کیا نہیں ہوگا۔ یہ میں ابھی بتا سکتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ اس اخبار میں کسی اُستانی کے، کسی ماسٹر جی کے معاشقے کی خبریں شائع نہیں ہوا کریں گی۔ نہ کسی بے چاری نرس کے بھاگ جانے کا ذکر ہوگا اور نہ اس کے چاہنے والے کی مار پیٹ کا احوال، اس اخبار میں نہ پٹواریوں اور چپراسیوں کے خلاف مراسلے شائع ہوں گے اور نہ ایمان دار، افسروں کو بلیک میل کرنے کے لئے سنسنی خیز خبریں۔ اس میں بے زبان اور مظلوم عورتوں کے لئے بے بنیاد الزامات اور دوسرے دن بہ عوض مختنانہ ان کی تردید بھی شائع نہیں ہوگی۔

ہم کوشش کریں گے کہ صرف وہی خبر شائع ہو کہ جس کے متعلق ہمیں یہ اطمینان ہو کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اسلئے اس اخبار میں کوئی ایسی خبر یا مضمون شائع نہیں ہو گا کہ جس کی اشاعت میں عوامی مفاد کی بجائے ایڈیٹر کی جیب کا مفاد مضمر ہو، مراسلوں کی اشاعت کے لئے مراسلہ نگاروں سے کوئی نذرانہ وصول نہیں کیا جائے گا اور نہ دوسرے دن ان کی تردید کے لئے تردید کرنے والے سے ہرجانہ! ہم حتیٰ الامکان اور حتی المقدور صاف ستھری صحافت کا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اس لئے جو لوگ غلاظت اور کثافت کے بل بوتے پر اپنے چار پیسے کما رہے ہیں۔ انہیں ہم سے خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!

۲۰ مئی ۱۹۷۷ء

سیاسی اور غیر سیاسی لوگوں سے مل کر میں ایک خوشی محسوس کرتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں اکثر موقعہ پا کر اُن لوگوں کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتا ہوں جو سیاسی اور غیر سیاسی دنیا میں ایک خاص مقام اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے مولانا سعید مسعودی اور پروفیسر محی الدین حاجنی کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا اور بانڈی پورہ میں محمد شفیع قریشی کی ایک انتخابی تقریر سننے کا بھی موقعہ ملا۔ میں نے ان بزرگوں سے کیا سنا اور کیا محسوس کیا۔ قارئین آئینہ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

گاندربل کا مرد فقیر:۔

مولانا سعید مسعودی آج کل نئے مکان میں رہ رہے ہیں۔ گیٹ کے پاس کئی کاریں رُکی ہوئی تھیں جو اس بات کی غماز تھیں کہ مولانا کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ مولانا کے کمرے میں پہنچ کر اندازا ہوا کہ بکروں

کے ساتھ ساتھ کچھ شیر بھی مولانا کے گھاٹ کا پانی پینے کے لئے بیتاب ہیں۔ بکروں کی غیر معمولی سنجیدگی بھانپ کر مجھے ان شیروں پر کافی ترس آیا جو بیدلرزاں کی طرح کانپتی ہوئی مونچھوں پر بار بار اپنی زبان پھیر رہے تھے۔ مولانا کمرے میں خلاف معمول موجود نہ تھے۔ مولانا کی غیر موجودگی کے بارے میں جب میں نے ایک چکراتے ہوئے شیر سے دریافت کیا تو وہ دم بخود ہو کر ہانپنے لگا۔ ''کافی دیر سے اندر گئے ہوئے ہیں۔ اُن کے ساتھ کئی عورتیں بھی تھیں اور ایک مرد بھی تھا۔ جو بالوں کے انداز سے ایک پورا مسخرہ محسوس ہوتا تھا۔'' میں نے وقت دیکھا تو شام کے چھے بج رہے تھے۔ اسی اثناء میں مولوی صاحب کے خاص ایلچی تشریف لائے اور یہ منادی کرائی کہ وہ آرہے ہیں۔ ٹھیک دس منٹ گذرنے کے بعد مولوی صاحب تشریف لائے اور ہاتھ ملا کر ہماری خیر و عافیت پوچھنے لگے۔ مولانا کے چہرے پر ایک خوشی تھی ایک نور تھا۔ اس سے پہلے کئی بار میں نے انہیں بہت کمزور اور لاغر دیکھا تھا۔ مگر خلاف توقع مولانا آج ہشاش بشاش نظر آرہے تھے.....

کشمیر کی سیاست کے متعلق میں نے جب اُن کی رائے دریافت کرنی چاہی تو انہوں نے جنتا کی بات چھیڑی۔ مولانا کے انداز سے محسوس ہوا کہ سابقہ گنہگاروں نے توبہ کے بعد اپنا نام جنتا رکھ دیا ہے اور وہ مستقبل قریب میں ہر لحاظ سے جنتی کہلائے جائینگے۔ مولانا نے اُمید ظاہر کی کہ جنتا ریاست میں ایک مضبوط پارٹی کے طور پر اُبھرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شیخ صاحب کے متعلق جب میں نے مولانا سے دریافت تو وہ ہنس کر فرمانے لگے کہ اگر

قوم نے شیخ صاحب کا کچھ بگاڑا ہوتا تو میں قوم کے خلاف شیخ صاحب کا ساتھ دیتا اور اگر میں نے شیخ صاحب کے ساتھ ظلم کیا ہوتا تو قوم کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ مجھے اس کی سزا دیتے مگر شیخ صاحب کی تباہی مانگے کی تباہی ہے جس کے لئے خود شیخ صاحب سزاوار بھی ہیں اور ذمہ وار بھی۔ شیخ صاحب نے ہمیشہ من مانی کاروائیاں کر کے اپنے دوستوں کی تعداد کو تشویش ناک حد تک گھٹایا ہے جس کی ذمہ داری خود اُن پر عائد ہوتی ہے۔

پروفیسر حاجنی:۔

جب جب بھی مجھے حاجن پروفیسر صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا، یا تو وہ بستر میں سوئے ہوئے ملے یا چائے پیتے ہوئے اور تیز تیز باتیں کرتے ہوئے ملے ۔ حاجنی صاحب کسی زمانے میں شیخ صاحب کے زبردست حامی و مداح تھے ۔ مگر اب کے بات بالکل برعکس ہے۔ زبان اور ادب کے موضوع پر جب اُن سے بات چھیڑی جاتی ہے تو وہ اپنی طرز فکر کے لحاظ سے ریاست کے پروفیسر بی رسل کے ہم پلہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ مگر جوں ہی سیاست موضوع بحث بن جاتی ہے۔ تو اُن کے مُنہ کا ذایقہ بگڑ جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی دُکھتی رگ چھیڑی گئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے گذشتہ ہفتے مجھے ایک واقعہ سنایا۔

ہارون رشید دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آرام فرماتے تھے گرمی کا موسم تھا اور مکھیوں کی جھنجھناہٹ اُن کی نیند میں مُخل ہو رہی تھی۔ مکھیوں کے کئی قافلے اُن کی حفاظت پر معمور تھے کان کے اندر تک حفاظت کا حق، بادشاہ وقت کو

مکھیوں کی زبردست گستاخی محسوس ہوئی۔ تو انہوں نے آرام کا ارادہ ترک کر کے ایک فقید المثال عالم کو یہ عندیہ بھیجا کہ وہ اسی وقت دربار میں حاضر ہو جائے۔ دربار کا قاضی حاضر ہوا۔ ہارون نے سوال کی وضاحت چاہی کہ آخر وہ کون سی مجبوری تھی، کائنات کے خالق کے ہاں جو اس ناچیز مکھی کو بادشاہوں کے آرام میں مخل کرنے کے لئے پیدا کیا۔ اگر چہ دنیا کی سبھی چیزوں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا! قاضی صاحب نے بڑی عاجزی کے ساتھ جواب دیا کہ کائنات کی سب سے زیادہ اور فائدہ مند مخلوق خالق کے درمیان مکھی ہی ہے۔ مکھی ظاہری طور پر تو ایک حقیر شے ہے۔ مگر خدا نے بادشاہوں کا غرور ختم کرنے کے لئے اس مخلوق کو دنیا پر مسلط کیا ہے......
ہارون نے یہ سن کر اپنا غصہ پی لیا۔ اس کے بعد حاجنی صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب جیسے مغرور اور بے رحم بادشاہ کی نیند حرام کرنے کے لئے سردیوں کے موسم میں قدرت نے ''کار اور مفتی'' جیسی مکھیاں بھی معرض وجود میں لائی ہیں۔

شفیع قریشی:۔

گذشتہ روز میں سرینگر سے آرہا تھا۔ اور پنچایت باندی پورہ میں ایک بے رنگ اور بے ذوق جلسی ہو رہی تھی۔ جس سے قریشی صاحب خطاب کر رہے تھے ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد قریشی صاحب اب وقت گذارنے کے لئے ''جلسوں'' میں تقریر بازی کی مشق کر رہے ہیں اور یہ مشغلہ بھی کچھ کم نہیں۔ مگر جس ''جلسی'' سے قریشی صاحب خطاب کر رہے تھے اگر چہ تعداد میں لوگ زیادہ نہ تھے۔ مگر اُن کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا

کہ انہیں بانڈی پورہ کے لوگوں نے رد کر دیا ہے کیونکہ ان کا سابقہ ریکارڈ بہت ہی گھناونا رہا ہے۔ قریشی صاحب نے بانڈی پورہ کے ذی شعور لوگوں سے اپیل کہ وہ کانگریس کے محمد انور خان کو ووٹ دے کر کامیاب بنائیں مگر قریشی صاحب! بانڈی پورہ کے چند باشعور لوگوں سے جب میں نے اس اپیل کے بارے میں پوچھا تو اُن کا جواب جو ملا اُسے تفصیل کے ساتھ آپ کی واقفیت کے لئے پیش کر رہا ہوں۔

خان صاحب ہمیشہ دفعہ ۱۴۴ کی طرح لوگوں پر نافذ کئے گئے ہیں اوران کی گزشتہ گیارہ سال کی کارکردگی انتہائی مایوس کن ہے۔ خان صاحب اپنے دور حکومت میں صرف دو کام کئے ہیں۔ اپنے دو نا اہل اور نا کار دامادوں کوملازمت دلا سکے ہیں جبکہ بانڈی پورہ میں تعلیم یافتہ ہُنر مندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ خان صاحب نے ہمیشہ لوگوں کے مفادات سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ کالج کی اَلاٹمنٹ کے لئے حکومت نے جب فنڈ فراہم کئے تو یہی خان صاحب تھے جو باشعور لوگوں کی استدعا کے باوجود مخالفت پر اڑے رہے۔ سٹیڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں خان صاحب نے حکومت کو اس کی منسوخی کے لئے مجبور کر دیا خان صاحب بیروزگار نوجوانوں کی درخواستوں پر اپنی طرف سے (Recommendation) سفارش بھی باعث ہتک محسوس کرتے تھے کئی لوگوں سے اظہار خیال کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ایک آزاد اُمیدوار کے لئے بانڈی پورہ میں فضا بالکل سازگار ہے۔

نیشنل کانفرنس کی جیت:۔

گزشتہ دو سال اقتدار میں رہ کر نیشنل کانفرنس کی عوامی ساکھ کو جو دھچکا لگا ہے اس کے طفیل یہ رائے حق بجانب قرار دی جاسکتی ہے کہ نیشنل کانفرنس نئے جنم کے باوجود زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہے۔ نیشنل کانفرنس کا ایک شاندار ماضی رہا ہے اگرچہ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس فلک بوس شیش محل کو پتھروں سے چکنا چور کرنے کا سہرا بھی اُن ہی ہاتھوں کے سر ہے جو اس کی تعمیر میں صناعی کا حق ادا کر چکے ہیں۔

۲۵ نومبر ۱۹۷۸ء

عید اور سیاست :-

عید الاضحیٰ کا فلسفہ قربانی، ایثار اور خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کے اس جذبے کی تجدید سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر کے کیا تھا...... اس دور میں جبکہ ہمارے حکمران اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی خاطر اپنی قوم کے مفادات اور اپنا ایمان تک قربان کر دیتے ہیں ...... عید الاضحیٰ کی اہمیت اور معنویت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مقدس اور متبرک تقریب پر بھی ہمارے حکمران اپنی روح کو غسل دینے کی بجائے اداکاری، ریاکاری اور سیاست گری کا بازار گرم کر کے غریب عوام کو مسلسل فریب دینے کے اپنے شغل سے باز نہیں آتے...... عید گاہوں میں عید کے موقع پر سیاسی تقریریں اور مظاہرے کرنے کی روایت بھی بابائے قوم جناب شیخ محمد عبداللہ نے شروع کی ہے۔ اور اب ان کی دیکھا دیکھی نیشنل کانفرنسی حکومت کا ہر وزیر اور نمبردار عید گاہوں میں قوم سے خطاب کرنا اپنا پیدائشی حق اور فرض منصبی سمجھنے لگا ہے۔

ٹھیک جس طرح محترم شیخ صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ عید گاہ میں نماز عید ادا کرنے والا ہر شخص ان کا ذاتی وفادار اور ان کی بدلتی ہوئی سیاست کا مستقل خریدار ہے۔ اُسی طرح ہر گاؤں اور ہر قصبے میں ان کے چیلے ، نماز عید کے ہر مقتدی کو نیشنل کانفرنس کا والنٹیر سمجھ کر اس سے خطاب شروع کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ کہ ہر عید گاہ سیاست کی آماجگاہ اور فلسفہ عید کی قربان گاہ بن جاتا ہے۔ سرینگر میں عید کے دن کاوڈارہ کے قریب دو مخالف سیاسی گروہوں کا تصادم اور اننت ناگ میں مرزا محمد افضل بیگ اور غلام نبی کوچک کی معرکہ آرائی اسی سیاست گری اور جنگ زرگری کا ایک حصہ ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے لیڈران کرام کم از کم عید کے دن نماز عید میں شرکت کرنے والے مسلمانوں کو اپنی تقریروں کے کڑوے گھونٹ پلانے سے احتراز کریں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ اس متبرک دن پر بھی ہمارے سیاسی رہنما اور سرکاری وزیر اپنی ذات، سیاست اور حکومت کا پرچار کر کے عید گاہوں کے تقدس اور ان کی پاکیزگی کو مجروح کردیں۔ شیخ صاحب ساری زندگی مذہب اور سیاست کو انسانی زندگی اور فکر کے دو الگ الگ شعبے قرار دیتے رہے ہیں۔ لیکن جب سے وہ وزیر اعظم ہو گئے ہیں۔ وہ درگاہ شریف حضرت بل اور عید گاہ دونوں مقامات پر اپنی حکومت کی وکالت اور اس کی پالیسیوں کی وضاحت کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ کیا انہیں اپنے محکمہ اطلاعات کی کارکردگی پر اعتماد نہیں کہ جو وہ خود افسر اطلاعات بن کر اپنی حکومت کی کارروائیوں اور کارکردگیوں کا ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتے ہیں۔ ہمیں ان

کے اطلاعاتی رول پر کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر وہ اس مقصد کے لئے خانقاہوں، زیارت گاہوں اور عید گاہوں کو استعمال نہ کرتے۔

دوہرے معیار:-

عید الاضحیٰ کے دن عید گاہ میں ریاست کے وزیر اعظم جناب شیخ محمد عبداللہ نے جو تقریر دل پذیر ارشاد فرمائی، وہ زندگی سیاست اور حکومت میں ان کے دوہرے معیاروں کی ایک اچھی مثال ہے شیخ صاحب نے اہالیاں شہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''سردی کا موسم آ گیا ہے۔ اور موسم سرما میں آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے آپ کو اپنے اندر خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے علاوہ صبر اور ضبط کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔'' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے سے سردی کی شدت کم کیسے ہوگی اور خدا اعتمادی کے سہارے کوئلوں کی فراہمی اور برقی رو کی دِقت کے مسائل کیوں کر حل ہوں گے؟ بجائے اس کے کہ شیخ صاحب لوگوں کو یہ اطمینان دلاتے کہ ان کی حکومت نے موسم سرما کی تمام ضرورت کی بہم رسانی کے تسلی بخش انتظامات کئے ہیں۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے اس محاذ پر اپنی حکومت کی نا اہلی اور ناکامی کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دی ہے یہی وجہ ہے کہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے علاوہ انہیں صبر وضبط کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ بقول شیخ صاحب ''ہر مشکل پر قابو پانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ موسم سرما کے لئے وادی میں رہنے والے بدنصیب لوگوں کو ضروریات زندگی فراہم کرنا۔ ریاستی

حکومت کی کم سے کم ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اور شیخ صاحب کی پیشرو حکومتیں خوداعتمادی اور خدااعتمادی کا سہارا لئے بغیر ان فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکی ہیں۔ لیکن بابائے قوم اپنی حکومت کی ناکامیوں پر خود اعتمادی اور خدااعتمادی کا پردہ ڈال کر بیک وقت ایک ٹکٹ میں دو مزے لے رہے ہیں۔ ایک اپنی حکومت کی ناکامی اور نامرادی کا جواز پیش کرنے کا مزا اور دوسرا اپنی خوداعتمادی اور خدااعتمادی کا پروپگنڈا، شیخ صاحب کا دوسروں کو خوداعتمادی اور خدااعتمادی کا درس دینے کی اس ادا کا اس پس منظر میں جائزہ لینا چاہئے کہ موسم سرما کی قہر سامانیوں کا خوداعتمادی اور خدااعتمادی کے بل بوتے پر مقابلہ کرنے کے لئے ان کے اپنے خاندان کا ایک بھی فرد یہاں موجود نہ ہوگا۔ اور خود جموں میں ان کی سرکاری قیام گاہ میں بجلی کی ایک خصوصی لائن صرف اس لئے لگادی گئی ہے کہ وہاں تین تین چار چار ہزار واٹ کے بجلی کے درجنوں ہیٹر چوبیس گھنٹے جلتے رہیں...... انہیں یا ان کی کابینہ کے کسی رکن کو موسم سرما کی بے اعتدالیوں اور من مانیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے خوداعتمادی یا خدااعتمادی کی اس لئے ضرورت نہیں ہوگی کہ ان میں سے کسی کو کوئلہ، بالن یا راشن خریدنے کی مصیبت برداشت نہ کرنا پڑے گی۔ شیخ صاحب شاید اپنی وہ تقریر بھول چکے ہوں کہ جو انہوں نے اقتدار کے پنجرے میں بند ہونے سے دو یا تین سال قبل سرینگر میں کی تھی۔ اور جس مین انہوں نے بجلی کی چوری کا جواز دیتے ہوئے کہا تھا کہ اگر حکومت کوئلے، بالن اور مٹی کا تیل فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ تو پھر عام لوگ

بجلی کی چوری نہ کریں تو کیا کریں گے"......اس وقت شیخ صاحب نے لوگوں کو خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے سہارے اپنے جسم اور چولہے گرم کرنے کا مشورہ نہ دیا تھا......لیکن آج انہیں قدم قدم پر خدا یاد آ رہا ہے۔

بقول شاعر ؎

ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

مجاہدین آزادی کا نیلام:-

شیخ صاحب اور ان کے صاحبزادے طارق عبداللہ دونوں کو سرکاری ملازمین کا سیاسی سرگرمیوں اور ٹریڈ یونین کاروائیوں میں حصہ لینا سخت ناپسند ہے۔ باپ نے اس جرم میں ایک درجن سے زائد کم تنخواہ پانے والے سرکاری ملازمین کو ملازمت سے برطرف کر کے انہیں کسی قیمت پر بحال نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اور بیٹے نے باپ کے نقش قدم پر چل کر ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے سو سے زائد افراد کو صرف اس لئے بے کار اور بیروزگار بنا دیا ہے کہ وہ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی فیڈریشن سے وابستہ ہو کر اپنے جائز حقوق کے لئے جدوجہد کرتے تھے۔ باپ بیٹے کا یہ اصول صحیح ہے یا غلط اس وقت اس سے بحث نہیں لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں ہی اپنے اس اصول کے نفاذ اور استعمال میں بھی بے اصولی اور جانبداری کا مظاہرہ کرتے آئے ہیں۔ طارق عبداللہ ایک سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انگریزی اخبارات میں بڑی باقاعدگی سے سیاسی معاملات اور نزاعی مسائل پر مراسلے شائع کرتے رہتے ہیں۔ اور اُس وقت انہیں یہ یاد نہیں رہتا

کہ سرکاری قواعد اور ضوابط کی رو سے ایسا کرنا ناجائز ہے۔ جہاں تک کارپوریشن کے چیرمین یعنی ان کے والد محترم کا تعلق ہے۔ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ اخبارات میں اپنے صاحبزادے کے خطوط پڑھ کر پھولے نہیں سماتے کہ ان کے خاندان میں بھی پچاس سال بعد ایک صاحب قلم پیدا ہوا ہے۔سرکاری ملازموں کو سیاست میں دخل دینے کی آزادی صرف طارق عبداللہ تک ہی محدود نہیں...... شیخ صاحب کے ایک اور چہیتے افسر صدر الدین مجاہد صاحب کو بھی خصوصی طور پر آزادی دی گئی ہے اور مجاہد صاحب ہر اعتبار سے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ہر سیاسی مسئلے اور معاملے میں ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں۔اس مقصد کے لئے مجاہد صاحب نے اپنے آپ کو کسی فریڈم فائٹرس آرگنائزیشن کا صدر منتخب کروایا ہے۔اور ان کا خیال یہ ہے کہ فریڈم فائٹری کی یہ زرہ بکتر پہن کر وہ ہر سطح کی سیاست گری کے لئے آزاد ہیں۔مقامی سیاست میں مجاہد صاحب جس بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ مجاہدین آزادی کا استعمال اور استحصال کرتے آئے ہیں۔وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔اور حق یہ ہے کہ ان سے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے۔انہوں نے مجاہدین آزادی کا کفن بیچ کر اپنی سیاسی دکان اور سرکاری تنخواہ چالو رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔لیکن وہ ملکی سیاست میں بھی مجاہدین آزادی کے نام اور کام کے دام وصول کرنے میں پیش پیش ہیں۔ایمر جنسی کے دوران شیخ صاحب کے اس کاغذی مجاہد نے ایمر جنسی، مسز گاندھی اور سنجے گاندھی کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر مجاہدین آزادی کا نام

بدنام کیا۔ پھر مارچ ۱۹۷۷ء میں مسز گاندھی کی انتخابی مہم میں ان کی حمایت کے لئے مجاہدین آزادی کا ایک طوفانی دستہ بھیجنے کی پیشکش کی۔ لیکن جب مسز گاندھی ہار گئیں تو مجاہد صاحب اپنے مجاہدین آزادی کو لے کر کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر رفتہ رفتہ مرارجی ڈیسائی اور مرکزی سرکار کی قصیدہ خوانی شروع ہو گئی۔ جو ابھی تک جاری ہے۔ اب ابھی حال ہی میں صدر الدین مجاہد نے مجاہدین آزادی آرگنائزیشن کے صدر کی حیثیت سے مسز گاندھی کو چک منگلور میں ان کی کامیابی پر مبارکبادی کا تار دیا ہے۔ یہ سب کچھ سیاست نہیں تو اور کیا ہے اور کیا صدر الدین مجاہد فریڈم فائٹرس ایسوسی ایشن کا صدر ہونے کی حیثیت سے ہر سرکاری قانون، ضابطے یا پابندی سے بالا ہیں؟ مجاہد صاحب کی یہ سیاسی سرگرمیاں چونکہ شیخ صاحب کو راس آتی ہیں۔ اس لئے وہ ان سے باز پرس کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ چاہے ایسا کرتے ہوئے سرکاری ڈسپلن اور نظم ونسق کی دھجیاں فضاء آسمان میں کیوں بکھر نہ جائیں لیکن صدر الدین مجاہد کی خانہ ساز آرگنائزیشن سے وابستہ مجاہدین آزادی کو سوچنا چاہئے کہ مجاہد صاحب ان کے ایثار اور اپنی صدارت کو بیچ کر کب تک ان کو رسوا کرتے رہیں گے۔ وہ جس طور اور جس طریقے پر مجاہدین آزادی کی تجارت کر رہے ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مجاہدین آزادی بھک منگے ہیں کہ جو بڑی ڈیوڑھی پر سلام بجا لا کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کر رہے ہیں۔ مجاہدین آزادی کا یہ تصور بھیانک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

رفیق صادق کا خط:-

''آئینہ'' کی ایک حالیہ اشاعت میں'' عالم خاک کی ڈاک'' کے عنوان تلے خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کے نام ان کے ایک مداح کا خط شائع ہوا تھا۔ جس میں مصنف نے لطیف پیرایے میں ان کے صاحبزادے رفیق صادق کی سیاست پر ایک ہلکا سا طنز کیا تھا۔ رفیق صاحب نے اپنے اس ذکر خیر پر برہم ہوکر شمیم صاحب کے نام ایک بڑا زوردار خط لکھا ہے۔ جو ہم املا وانشاء اور زبان کی تمام غلطیوں کے ساتھ من وعن شائع کر رہے ہیں۔ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ خط مزاحیہ ہے۔ طنزیہ ہے۔ یا تنقیدی، اُمید ہے کہ قارئین اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں ہمیں مدد دیں گے۔ خط کا متن یہ ہے۔

پیارے شمیم

تسلیم

فطرتاً بشر ہوں۔ اور ہر بشر کی طرح دل رکھتا ہوں۔ ویسے بھی کوئی شخص اپنے والدین کو نہیں بھول سکتا۔ لیکن آپ کی طفلگی اور بے ظرفی نے مجھے میرے والد محترم کی یاد عید سے دو روز قبل دلا کر بہت جذبات میں الجھا دیا۔ جس کے نتیجے میں آپ کی توقعات کے خلاف ایک دو روز قبل ہی مرحوم والد محترم مجھے خواب میں ملے اُن کی زبانی کہ'' آپ نے اُن سے مجھ سے پہلے ہی خواب میں ملاقات کی ہے'' سن کر میرے حیرت کی حد نہ رہی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ آپ انتہائی موقعہ پرستی کا ثبوت دے کر

خواب دیکھنے میں بھی پہل کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اپنے والد محترم کو اپنے سیاسی شعور اور سیاسی دور اندیشی پر بالکل مطمئن پایا لیکن جہاں تک آپ کا تعلق ہے۔ اُن کو آپ کی پینترے بازی مصلحت ...... پسندی اور آپ کی تفصلا تاً سیاسی اچھل کود پر توقعات کے مطابق حیران دیکھا۔ انہوں نے آپ کو اندرا جی کا ساتھ دینے کے لئے کہا تھا۔ لیکن آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کہ اگر اندرا جی اور شیخ صاحب کا آپس میں ساتھ نہ ہوتا۔ تو میں اندرا گاندھی کیا سنجے گاندھی، بنسی لال، وی سی شکلا اور گنڈوراوٴ کے صف اوّل کے سپاہی میں ہوتا۔ میں نے اپنے والد محترم سے خواب میں وعدہ کیا ہے کہ میں مستقبل میں شمیم صاحب کو موقعہ پرستی، مصلحت پسندی اور تفصلا تاً سیاسی اچھل کود سے باز رکھوں گا۔ مجھے اُمید ہے۔ کہ آپ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہیں گے تا کہ میں اپنے والد محترم کو خواب میں دیئے ہوئے وعدے کو پورا کر سکوں۔

شکریہ

آپ کا رفیق صادق

۱۷ نومبر ۱۹۷۸ء

☆

۲۹ اپریل ۱۹۷۶ء

پارلیمنٹ کا موجودہ اجلاس :-

پارلیمنٹ کا موجودہ بجٹ اجلاس پچھلے دو ماہ سے چل رہا ہے۔ اور پروگرام کے مطابق ۲۲ مئی کو ختم ہوگا۔ جن لوگوں کو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ سے پہلے لوک سبھا اور راجیہ سبھا کی کاروائی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو، وہ اگر آج پارلیمنٹ کی کاروائی کا مشاہدہ کرنے کے لئے چلے جائیں تو اِن کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی پارلیمنٹ ہے، وہی ایوان جو سوالات کا گھنٹہ ختم ہوتے ہی میدانِ کارزار میں بدل جاتا تھا، اور جہاں شور شرابے کا وہ عالم ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ تو الگ، خود ممبران بھی ایک دوسرے کی بات نہیں سُن پاتے تھے، اب اتنا خاموش اور پُرسکون نظر آتا ہے کہ اس کی خامشی پر قبرستان کی سی خاموشی اور ویرانی کا گمان ہوتا ہے۔ پہلے ٹھیک بارہ بجے پریس اور پبلک گیلریاں بھری نظر آتی تھیں، تو عام ممبران بھی کسی نہ کسی ہنگامے کی توقع میں ایوان میں بیٹھے رہتے، اب ٹھیک بارہ بجے اخبار نویس پریس گیلری چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں اور پبلک گیلریوں میں تو ویسے بھی

اب بہت کم لوگ نظر آتے ہیں۔ میں نے دن میں انہیں اکثر خالی ہی دیکھا ہے۔ حالانکہ ایمرجنسی سے پہلے ان کے باہر ایک لمبا سا کیو لگا رہتا تھا، پارلیمنٹ کی کاروائی سے عام لوگوں کی یہ عدم توجہی قابل فہم ہے۔ خود ممبروں کو بھی اب بحث مباحثے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور دن بھر بڑی مشکل سے پندرہ، بیس یا زیادہ سے زیادہ تیس ممبران ایوان میں موجود رہتے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر وہ ممبران ہوتے ہیں کہ جنہیں منسٹر فار پارلیمنٹری آفیسرس زبردستی بٹھائے رکھتے ہیں۔ بحث میں حصہ لینے والے ممبران کی تقریروں کا معیار بھی اب وہ نہیں ہے کہ جو ہوا کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ پارلیمنٹ کی اہمیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے سیاسی نظام میں پارلیمنٹ کے مرتبے اور اس کی اہمیت میں یہ بتدریج کمی مستحسن ہے یا نہیں اور اس کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑے گا۔ یہ ایک اہم سوال ہے۔ لیکن اس کا جواب دینے سے پہلے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ آیا ہم اس پارلیمانی ادارے کا صحیح استعمال کر رہے تھے، میرا اپنا خیال ہے کہ گذشتہ دس پندرہ برسوں میں بالخصوص بعض جماعتیں اور بہت سے ممبران پارلیمنٹ کو ایک سنجیدہ سیاسی ادارے کی بجائے اپنی ذاتی نمود شہرت اور جولانی طبع کے مظاہرے کے لئے استعمال کرتے تھے، اور حزبِ مخالف کے دوست مجھے معاف کریں گے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ پارلیمنٹ کو پارلیمنٹ کی بجائے ایک ایسا اسٹیج سمجھتے ہیں کہ جہاں اداکار اپنے کرتب دِکھا دکھا کر تماشائیوں کو خوش کرتے ہیں، پارلیمنٹ کے منصب اور اس کی اہمیت و

عظمت کو کم کرنے کی ذمہ داری اگر حکمران کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔ تو میری نگاہ میں حزبِ مخالف کے ممبران بھی اس کے لئے کچھ کم ذمہ دار نہیں ہیں۔ پارلیمنٹ کا ممبر بننے سے پہلے بھی میں اکثر ایوان کی کارروائی کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں اور انہی دنوں مجھے یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ اگر حزب مخالف کے ممبران اس طرح غیر ذمہ داری اور بعض اوقات غنڈہ گردی سے کام لیتے رہے تو پارلیمانی ادارے کا جوں کا توں قائم رہنا مشکل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے بعد مجھے اس بات کا ذاتی تجربہ ہوا کہ حزب مخالف کے بہت سے ممبران اپنی ذاتی نمود و شہرت کی ہوس اور پبلسٹی کے شوق میں اس عظیم ایوان اور اس کی روایات کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، اس قسم کے ممبران میں سوشلسٹ پارٹی کے مدھو لیمائے اور مارکسٹ پارٹی کے جیوتر موئے باسو کے نام قابل ذکر ہیں۔

مدھو لیمائے بہت پُرانے اور تجربہ کار سیاسی کارکن ہیں۔ وہ بے حد ذہین، بہت محنتی اور بڑے دیانتدار آدمی ہیں۔ اُنہوں نے اپنی محنت، اپنے ریاض اور لگن سے ہندوستان کی پارلیمانی تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا ہے، اور پارلیمنٹ میں ان کی کارکردگی اور ان کی مستعدی کا کوئی جواب نہیں۔ وہ حکمران جماعت کے لئے ایک مستقل خطرہ بنے رہتے، اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ جس میں حکومت کی کمزوری کو بے نقاب کرنے کا امکان ہوتا۔ وہ اچھے مقرّر بھی ہیں اور بے حد نکتہ شناس بھی اور ملک بھر میں انہیں لوگ ایک موثر بے خوف، بے ریا اور ایماندار پارلیمنٹرین کی حیثیت

سے جانتے ہیں...... لیکن مدھو لیمائے کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ اپنی ان فتوحات کے نشے میں اپنے آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ انہیں پبلسٹی اور شہرت کی وہ لت پڑ گئی تھی کہ وہ اخبار میں ہر روز اپنا نام چھپوانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ اکثر ایسے ایسے بے مطلب اور بے ہودہ مسائل پر پارلیمنٹ کا قیمتی وقت ضائع کیا کرتے تھے کہ جن سے ان کے علاوہ کسی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، محض اخبارات میں اپنا نام دیکھنے کی ہوس میں انہوں نے پارلیمانی روایات کی کئی بار بے حرمتی کی اور وہ برملا طور پر اس بات کا اعتراف کیا کرتے تھے کہ اس کا مقصد پبلسٹی ہے باوجود اس کے کہ انہوں نے پارلیمانی ضوابط کے گہرے مطالعے اور استعمال سے ہی ملک بھر میں اپنا نام پیدا کر دیا تھا، پچھلے تین چار سال سے وہ برابر پارلیمانی قواعد اور ضوابط کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔ ایک بار انہوں نے سپیکر کے ہاتھ سے کسی بیان کی کاپی حاصل کر کے بھرے ایوان میں اسے پھاڑ ڈالا اور مقصد صرف یہ تھا کہ دوسرے دن مدھو لیمائے کی اس ''جواں مردی'' کا اخبارات کے صفحہ اوّل پر تذکرہ ہو اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جوں جوں انہیں پبلسٹی ملتی گئی، ان کی بھوک بھی بڑھتی گئی، اخبار والوں نے خاص طور پر ان کا دماغ بگاڑ دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو اس درجہ طاقت ور سمجھتے تھے کہ انہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ایک دن نہیں، بلکہ مہینوں گذر جائیں گے کہ ان کا نام اخبار میں نہیں چھپے گا اور یہی عالم جیوتر موئے باسو کا بھی تھا۔

پچھلے دنوں چھ سات ماہ کے بعد مدھو لیمائے کا نام اخبار میں چھپ

گیا۔ انہوں نے ۱۸ مارچ کو پارلیمنٹ کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ سپیکر
کے نام اپنے خط میں مدھو لیمائے نے کہا ہے کہ ۱۸ مارچ کے بعد چونکہ
موجودہ پارلیمنٹ کی مدّت ختم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے بعد اس ایوان
کا ممبر نہیں رہنا چاہتے۔ مدھو کا یہ فیصلہ ان کی اخلاقی جرأت اور ایمانداری کا
ثبوت ہے۔ انہوں نے وہ کچھ کیا ہے کہ جو حزبِ مخالف کے ہر ممبر، (جن
میں، میں بھی شامل ہوں) کو کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے لئے بڑی ہمت
اور حوصلہ چاہئے۔ اور مدھو لیمائے میں ہمت بھی ہے اور حوصلہ بھی
......افسوس کہ وہ اپنی شہرت اور پبلسٹی کی ہوس پر قابو نہیں پا سکتے۔

۴ مئی ۱۹۷۶ء

جواہر لال نہرو، مسز گاندھی اور اوم مہتہ :-

ایمرجنسی کے ایک سو ایک فائدوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے نفاذ کے بعد سے ہماری سماجی زندگی میں جو ربط و ضبط اور ڈسپلن پیدا ہوا ہے۔ وہ پچھلے ۳۰ برسوں میں مفقود تھا۔ اس سے پہلے زندگی کے ہر شعبے میں جو بے راہ روی اور ڈھیلا پن تھا وہ اب کہیں نظر نہیں آتا۔ اشیائے ضروری کی قیمتوں کا بے لگام گھوڑا جو کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ایمرجنسی کے بعد کچھ ایسا رام ہو گیا ہے کہ وہ گھوڑا کم اور گدھا زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ بسیں اور ہوائی جہاز جو ایک اور دو دو گھنٹے نہیں، ایک ایک دو دو دن لیٹ ہوا کرتے تھے۔ ایمرجنسی کے بعد سے ٹھیک وقت پر منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں اس طرح سرکاری افسر جو بسوں اور ہوائی جہازوں کی طرح عام طور پر لیٹ چلا کرتے تھے اب ٹھیک وقت پر اپنے دفتروں اور اڈوں پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ [illegible] کی خوبیاں گنائے رہیے لیکن جس طرح

ہر اچھی سے اچھی چیز اور بڑی سے بڑی نعمت میں بھی کوئی نہ کوئی بُرائی کا پہلو موجود رہتا ہے ٹھیک اس طرح ایمر جنسی نے اتنی ساری اچھائیوں کے ساتھ ہم میں اور ہمارے سماج میں کچھ بُرائیاں بھی پیدا کردی ہیں۔ اور آج کی صحبت میں دو ایسی ہی بُرائیوں کا ذکر مقصود ہے۔

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گِلہ بھی سُن لے

ایمر جنسی کے نفاذ سے پہلے بھی ہم بہادر، صاف گو اور بے ریا نہیں تھے لیکن ایمر جنسی کے اعلان کے بعد ہم لوگ کچھ زیادہ ہی بزدل، جھوٹے اور ریا کار بن گئے ہیں۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے ڈرتا ہے، ہر دوسرا آدمی تیسرے آدمی کو خفیہ پولیس کا اِنفارمر سمجھتا ہے، ہر چوتھا آدمی، پانچویں آدمی پر کسی چھٹے آدمی کے جاسوس ہونے کا شک کرتا ہے اور کسی محفل میں بیٹھ جائیے لوگ کھل کر بات کرنے کی بجائے اشاروں، کنایوں میں بات کریں گے۔ مجھے چند دن پہلے مقامی بار ایسوسی ایشن کے احاطے میں اپنے وکیل دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ایمر جنسی سے پہلے وکیل صاحبان دنیا کے ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرنا اپنا قانونی حق، آبائی پیشہ اور فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ لیکن آج پورے ماحول پر ایک ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ جیسے ہر وکیل صاحب کی زبان پر من کا بھرتالا ڈال دیا گیا ہو۔ میں نے جان بوجھ کر حالات حاضرہ کا ذکر چھیڑ دیا تو اپنی زبانوں کو قینچیوں کی طرح چلانے والے بہت سے وکیل صاحبان ایک ایک کر کے محفل سے اُٹھ گئے اور جو بیٹھے رہے وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے میری طرف یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے میں خفیہ

پولیس کا آدمی ہوں ۔ جو دو تین وکیل صاحبان میری باتوں کو توجہ سے سُن
رہے تھے، اُن پر مجھے خود یہ شک ہے کہ وہ محکمہ سراغ رسانی کے انفارمر تھے،
اور مجھے اب بھی یہ وہم ہے کہ اسی دن شام کو انہوں نے متعلقہ حکام کو میرے
بارے میں اپنی رپورٹ پیش کردی ہوگی ۔ میں جانتا ہوں کہ خوف اور ہراس
کی کیفیت بالکل ہمارے ذہنوں کی پیداوار ہے، اور ایمرجنسی کے باوجود اس
ملک میں فرد کی آزادی اور پُر امن طریقے پر اپنے خیالات کے اظہار کا حق،
جوں کے توں قائم ہے، لیکن اِس کے باوجود ہماری نفسیات میں ایک بہت
بڑی تبدیلی واقع ہوگئی ہے اور ہم اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگے ہیں، ہم
میں سے بہت سے لوگ اتنے ریاکار اور اداکار ہوگئے ہیں کہ ہم نہ صرف یہ
کہ دِل کی بات زبان پرنہیں لاتے ، بلکہ اپنے دل کی بات کو چھپانے کے
لئے اپنی زبان سے بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے سے بھی گریز نہیں کرتے،
میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں کہ جو وزیراعظم کے بیس نکاتی پروگرام
کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ، یا اگر جانتے ہیں تو اس کے متعلق اچھی
رائے نہیں رکھتے ۔ لیکن وہ اپنے دل کے چور کو چھپانے کے لئے رات دن
بیس نکاتی پروگرام کی گردان کرتے رہتے ہیں ۔ ایسے اداکاروں اور ریاکاروں
میں وزیر، ممبران پارلیمنٹ، ممبرانِ اسمبلی اور صحافی سبھی لوگ شامل ہیں ۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ ایمرجنسی نے جہاں بہت سے لوگوں کو جراٴتِ رندانہ عطا کی
ہے، وہاں اس نے بزدلوں اور ریاکاروں کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ کیا
ہے ۔ چاپلوسی اور خوشامد ہمارے قومی کردار کا ہمیشہ ایک جزوِ غالب رہا ہے ۔

لیکن ایمر جنسی نے ہماری اس خوبی کو کچھ زیادہ ہی نمایاں کر دیا ہے۔ اور ہم میں سے اکثر لوگ صرف خوشامد اور چاپلوسی کے سہارے آگے بڑھنے کے لئے بہت بے تاب نظر آتے ہیں اس دوڑ میں آپ اور مجھ جیسے غریب حقیر ہی شامل ہوتے، تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن اس میں بڑے بڑے وزیر، وزراءِ اعلیٰ، سفیر اور بہت سے عالی جناب بھی شامل ہیں اور ایمر جنسی کے بعد سے ہر شخص وقت بے وقت، محل بے محل، وجہ بے وجہ وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسز گاندھی نے اپنے عمل اور کردار سے ہندوستان کی تاریخ اور دُنیا بھر کے سیاستدانوں میں ایک ایسا مقام بنایا کہ ان کی تعریف نہ کرنا بخیلی اور تنگ نظری کی علامت ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے بعض مداح، جن الفاظ اور جس انداز میں ان کے قصیدے پڑھ رہے ہیں خود اِن کو بھی اس سے بڑی شرمندگی اور ندامت ہوتی ہوگی۔ اس قسم کی قصیدہ گوئی اور چاپلوسی کی تازہ ترین مثال اپنی ریاست کے ایک مایہ ناز سپوت شری اوم مہتہ، وزیرِ مملکت برائے ہوم کے وہ تازہ ارشادات ہیں کہ جو میکسکو کے ایک اخبار ''ایکسل شیرز'' میں شائع ہوتے ہیں۔ مہتہ صاحب نے اپنے طویل بیان میں صحیح طور ایمر جنسی کے بہت سے فوائد گنائے ہیں۔ انہوں نے ایمر جنسی کے جواز اور اس کی ضرورت پر بہت سے زور دار دلائل دیے ہیں اور بجا طور مسز گاندھی کی طاقت اور مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اِس ذکر میں اُنہوں نے اپنے آپ کو مسز گاندھی کا مسز گاندھی سے بھی زیادہ وفادار ثابت

کرنے کی کوشش میں کچھ ایسی باتیں کہی ہیں کہ جن سے بے لگام خوشامد اور چاپلوسی کی بُو آتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اوم مہتہ کی اس گوہر افشانی پر مسز گاندھی بھی کچھ خفیف ہوئی ہوں گی۔ مہتہ صاحب نے ترنگ میں آکر یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسز اندرا گاندھی اپنے باپ جواہر لال نہرو سے بھی زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اوم مہتہ صاحب کو جواہر لال اور مسز گاندھی کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا مقابلہ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی۔ اور کیا یہ مقابلہ کیے بغیر خوشامد اور چاپلوسی کا عمل پورا نہیں ہو سکتا تھا؟ لیکن ایمرجنسی کے قیود اور خوف کے باوجود میں یہ بات کہنے کی جسارت کروں گا۔ کہ جواہر لعل اور مسز گاندھی میں کوئی مقابلہ نہیں۔ مسز گاندھی اپنی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں کے باوجود جواہر لعل نہرو کے ذہن کی بلندیوں، ان کے آفاقی کردار اور ان کی شخصیت کے طلسم کو چھو بھی نہیں سکتی ہیں۔ وہ اپنے طور پر بہت عظیم ہیں۔ لیکن جب کوئی اوم مہتہ ان کی عظمت کا مقابلہ جواہر لعل کی عظمت کے ساتھ کرے گا۔ تو مسز گاندھی کا قد بہت چھوٹا نظر آئے گا۔ اور اسی لئے کسی اوم مہتہ کو مسز اندرا گاندھی کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ایمرجنسی کے بعد سے ہمارے قومی کردار کی خصوصیات کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو گئی ہیں۔

۶ مئی ۱۹۷۶ء

صدر ہسپتال کی کہانی:-

سنا تھا کہ سرینگر کے صدر ہسپتال کے نظم ونسق اور اس کی کارکردگی میں پچھلے کئی ماہ سے نمایاں فرق واقع ہوا ہے کل اس کا عملی تجربہ ہو گیا۔ چند دن پہلے علاقہ نارواو کے ایک دور افتادہ گاؤں سے آئے ہوئے ایک مریض کو لے کر ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر صاحبان نے بڑی محبت شفقت اور توجہ کے ساتھ مریض کا معائنہ کیا اور بالآخر اسے وارڈ نمبر ۱۸ میں داخل کر دیا گیا۔ اِسی دوران میں یہ معلوم ہوا کہ اب ہسپتال میں صرف مستحق اور دور دراز کے دیہات سے آئے ہوئے مریضوں کو ہی کھانا ملتا ہے اور میرا مریض چونکہ یہ دونوں شرائط پوری کرتا تھا، اس لئے ڈاکٹر صاحبان نے مجھے یقین دلایا، کہ اسے ہسپتال سے ہی غذا ملے گی۔ ڈاکٹروں کی مروّت اور ہسپتال کے حسنِ انتظام سے متاثر ہو کر میں گھر لوٹ آیا اور اپنی دوسری مصروفیات کی بنا پر دد

دن تک مریض کی خیر و عافیت کے لئے ہسپتال نہ جا سکا۔ دو دن بعد معلوم ہوا کہ مریض کو کسی نے کھانا تو کیا، پینے کے لئے ایک گلاس پانی بھی نہیں دیا ہے اور بے چارہ دیہاتی یہی سمجھتا رہا کہ شاید اس کے علاج معالجے کے لئے اِس کا بھوکا رہنا ضروری ہے۔ اسے کیا معلوم کہ میرے ہسپتال سے چلے آنے کے بعد وہ ڈاکٹروں کے ذہن سے بھی اُتر گیا، اور کسی کو یہ بھی یاد نہیں رہا، کہ اس غریب کو زندہ رہنے کے لئے دو لقمے چاول کی ضرورت ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں تین یا چار دن تک اس کی خبر گیری نہ کرتا، تو وہ بے چارا بھوک کی شدّت سے نڈھال ہو کر شاید اپنے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا ہوتا۔ میں ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس غفلت شعاری پر میرے سخت احتجاج کا نوٹس لے کر مریض کے حق میں دو وقت کا کھانا واگذار کر دیا۔ لیکن سوچتا ہوں کہ نہ معلوم اور کتنے مریض ڈاکٹر صاحبان کی عدم توجہی کا شکار ہو کر کئی دنوں سے بھوکے پڑے ہوں گے!

رنگوں کی بہار :-

شہر کے در و دیوار پر رنگ و روغن کا سلسلہ کیا شروع ہوا ہے۔ نکتہ چینوں اور پیشہ ور نقادوں کو تنقید کا ایک نیا موضوع مل گیا ہے ابھی تک کسی نقاد یا نکتہ چین نے بازاروں اور شاہراہوں کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی کے لئے ان پر نیا رنگ و روغن کرنے کی ضرورت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ مگر اب صبح سے شام تک موجودہ مہم کی برائیوں اور خامیوں کی نشان دہی ہو رہی ہے ۔ پرسوں ایک دُکان پر ایک محفل میں اسی موضوع پر بحث ہو رہی تھی ۔ اور

ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ مکانوں اور دکانوں پر رنگ کرانا تو ٹھیک ہے۔ لیکن رنگوں کی موجودہ سکیم ٹھیک نہیں۔ مناسب یہ تھا کہ کھڑکیوں پر سفید اور دروازوں پر سُرخ رنگ کیا جاتا۔ میں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر کھڑکیوں پر سفید اور دروازوں پر سُرخ رنگ ہی ہوا ہوتا۔ تو آپ اِس وقت یہ کہتے کہ کھڑکیوں پر سُرخ اور دروازوں پر سفید رنگ ہونا چاہیئے۔ محفل میں بیٹھے ہوئے بہت سے دوستوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ اور آپ کو تعجب ہوگا کہ چند لمحوں کے بعد اِس صاحب نے بھی میری تشخیص کو صحیح بتایا۔

ایک آرٹسٹ صاحب کافی ہاؤس میں تقریر کر رہے تھے کہ ''رنگ کرانے سے پہلے حکام کو شہر کے آرٹسٹوں سے کلر سکیم کے بارے میں مشورہ حاصل کرنا چاہیئے تھا'' ...... اِن کی رائے میں ''شہر کی موجودہ رنگ آمیزی ذوق جمال پر بار گزرتی ہے اور اِس سے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہونے کے بجائے اِس کی بدصورتی زیادہ نمایاں ہوگئی ہے۔'' ایک اور صاحب نے یہ نکتہ پیدا کر لیا کہ شہر میں رنگوں کی یہ بہار دراصل رنگ بیچنے والے ایک تھوک تاجر کو فائدہ پہنچانے کی کوششوں کا نتیجہ ہے، غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں...... اور یہ سارا سلسلہ اِس لئے شروع ہوا ہے۔ کہ بہت دنوں کے بعد ریاستی حکام نے ایک ایسا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ جس پر بہت پہلے عمل درآمد کیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن پیشہ ور اور پیدائشی نکتہ چینوں کو اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کوئی بھی موضوع مل جانا چاہیئے۔

ترکمان گیٹ کا سانحہ :-

معلوم ہوا ہے کہ دِلّی کے ترکمان گیٹ میں حالیہ فساد افواہ بازوں اور شرپسندوں کی مشترکہ مہم کا نتیجہ تھا۔ اور اِس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اِس فساد میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں، سرکاری اور اخباری اطلاعات کے مطابق بعض ممنوعہ جماعتوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے یہ افواہیں پھیلائیں کہ پولیس راہ گیروں کو زبردستی پکڑ کر لے جاتی ہے۔ اور پھر ان کی نس بندی کی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی عبادت گاہ کے گرائے جانے کا افسانہ بھی گھڑ لیا گیا۔ اور عام لوگوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہوگئے کہ وہ پولیس کے ساتھ مزاحمت پر تل گئے ۔ اور نتیجہ وہی نکلا کہ جو اس قسم کے حالات اور نفسیات کا ہوتا ہے۔ کئی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔ بہت سے لوگ زخمی ہوگئے ۔ اور حکومت کے مخالفین کو حکومت کے خلاف بدظنی اور بیزاری کا جذبہ پیدا کرنے کا موقع مل گیا...... ترکمان گیٹ کا واقعہ افسوسناک ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت ناک بھی ہے اور حاکمانِ وقت کو اس سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ جب اخبارات ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے اطلاعاتی اداروں کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ تو پھر افواہ بازوں کو افواہیں پھیلا کر شرارت کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اِس لئے ان کی شرانگیزی کا سدباب کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر عوام کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کیا جائے۔ ایمرجنسی کے بعد سے چونکہ اخبارات کی آزادی محدود اور ان کا کردار مشکوک بن گیا ہے۔ اس لئے افواہ بازوں نے اپنی دکان چالو کر دی ہے۔ اس دکان کو ناکام بنانے کے لئے

اخبارات کی آزادی کو بحال کرنا ضروری ہے...... یہ میری رائے ہے اور میری رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔

۲۱ مئی ۱۹۷۶ء

ہماری سیاست......تب اور اب :-

اسے اتفاق کہیے یا حسنِ اتفاق، کہ پیر محمد افضل مخدومی آج کل تحریک حُریّت کی تاریخ کا وہی باب لکھ رہے ہیں، کہ جب مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا تھا۔ یہ ٹھیک ۳۷ برس قبل کا قصّہ ہے، لیکن نیشنل کانفرنس کے احیاءِ نو کے پسِ منظر میں دیکھیے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ۳۷ برس پرانی تاریخ نہیں۔ آج ہی کی حکایت ہے۔ جو لوگ باقاعدگی سے مخدومی صاحب کی تحریر کردہ سلسلہ وار تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ انہیں کئی بار اِس بات کا احساس ہوا ہوگا کہ ہماری ریاست کی سیاست میں ایک عجیب قسم کی یکسانیت اور دلچسپ تسلسل موجود ہے۔ بعض اوقات چالیس برس پرانے واقعات کا ذکر پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، کہ جیسے یہ آج کی کہانی ہو۔ وہی شیر بکروں کی لڑائی، وہی مسائل اور وہی کشمکش، جو تحریک حُریّت کے آغاز اور اس

کے عروج کے وقت موجود تھے۔ صرف چہرہ کردار بدل گئے ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی کردار بھی وہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کشمیر کی تاریخ گول دائروں میں گھومتی بار بار اس نکتے پر آجاتی ہے، کہ جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ بات ہمارے لئے اچھی ہے یا بُری؟

ملک سپلائی سکیم کی تلاش:۔

اخباری اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے شہر میں عرصے سے ایک ملک سپلائی سکیم چالو ہے اور کبھی کبھی ریڈیو اور اب ٹیلی ویژن سے پتہ چلتا ہے، کہ اِس سکیم پر کتنا خرچ ہو رہا ہے اور اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ ہو رہا ہے۔ شامتِ اعمال سے میری بیوی نے کہیں ریڈیو سے یہ افسانہ سن کر اس پر اعتبار کر لیا۔ اور میرے پیچھے پڑ گئیں کہ ہم اس سکیم سے استفادہ کیوں نہیں کرتے؟ میں نے بیوی کو لاکھ سمجھایا کہ ریڈیو کی بات کا اعتبار نہ کرو اِس قسم کی کوئی سکیم اس شہر میں نہیں ہے لیکن وہ نہ مانیں اور چارو ناچار میں ملک سپلائی سکیم کی تلاش میں نکل پڑا۔ میری تلاش کو دس دن گزر گئے۔ لیکن ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ اِس سکیم کا محلِ وقوع اور حدود اربعہ کیا ہے؟ اِس سے دودھ حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس دودھ کا مستحق ہونے کے لئے کن کوالی فیکیشنز کی ضرورت ہے؟ اگر کسی صاحب کو کچھ معلوم ہو، تو براہِ کرم وہ مجھے دفتر "آئینہ" کے ذریعے مطلع کریں۔

بادشاہ سے زیادہ وفادار:۔

پچھلے دنوں جب وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ دہلی میں تھے، تو دہلی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے وائس چیرمین جگ موہن صاحب انہیں دہلی میں تعمیر ہونے والی نئی بستیاں دکھانے کے لئے لے گئے، یہ بستیاں خاص طور پر ان لوگوں کے لئے بنائی گئی ہیں کہ جنہیں شہر کے اندرونی گنجان آباد علاقوں سے اُٹھا کر وہاں آباد کیا جارہا ہے۔ شیخ صاحب ڈی-ڈی-اے کی اِس کارروائی کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اِس کام کی بڑی سراہنا کی، لیکن جب انہوں نے کھچڑی پور میں سینکڑوں لوگوں کو بغیر کسی انتظام کے ایک وسیع میدان میں اپنے گھریلو ساز و سامان کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ تو انہوں نے جگ موہن صاحب سے دریافت کیا، کہ ان لوگوں کو اپنے گھروں سے اُکھاڑنے سے پہلے آپ نے ان کی رہائش کا کوئی معقول انتظام کیوں نہیں کیا؟ تو جگ موہن صاحب آئیں بائیں شائیں کہنے لگے۔ شیخ صاحب نے کھچڑی پور سے ترکمان گیٹ جاتے ہوئے، وہاں سے دو ایسے آدمیوں کو اپنے ہمراہ لیا کہ جن کے مکانات ترکمان گیٹ میں تھے۔ اور جنہیں ابھی حال ہی میں منہدم کیا گیا تھا تا کہ وہ ان کی زبانی وہاں کے حالات دریافت کرسکیں۔ شیخ صاحب ابھی ترکمان گیٹ کے علاقے میں لوگوں سے حال احوال ہی پوچھ رہے تھے، کہ اِن دو آدمیوں میں سے ایک آدمی نے شیخ صاحب سے کہا کہ اِس کے دوسرے ساتھی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ شیخ صاحب کو حیرت ہوئی، لیکن یہ حیرت جلد ہی غصّے میں بدل گئی، کیونکہ معلوم ہوا کہ پولیس واقعی اِس آدمی کو گرفتار کر کے لے گئی ہے، شیخ صاحب کے ہمراہ

وزیرِاعظم کے خصوصی ایلچی محمد یونس صاحب بھی تھے، انہیں جب اِس بات کا علم ہوا، تو اُنہوں نے حکم دیا، کہ اس پولیس آفیسر کو گرفتار کیا جائے، جس نے اِس آدمی کو گرفتار کیا ہے۔ پولیس والا تو گرفتار نہ ہوا، لیکن کھچڑی پور کا غریب یونس صاحب کی مداخلت سے رہا ہو گیا۔ ایسے ہی پولیس آفیسر وزیرِاعظم کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ایسے افسروں کو گرفتار کیے بغیر وزیرِاعظم کا بیس نکاتی پروگرام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یونس صاحب کی برہمی:۔

وزیرِاعظم کے خصوصی ایلچی مسٹر محمد یونس کا ذکر آیا ہے۔ تو یہ بھی سن لیجئے کہ یونس صاحب ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' کے مصنفین سے سخت برہم ہیں۔ یونس صاحب کو بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ اس کتاب کے مصنفوں نے اپنی کتاب میں ایرے غیرے نتھو خیرے کا تو ذکر کیا ہے لیکن ان کا کہیں تذکرہ نہیں۔ حالانکہ بقول یونس صاحب کے ملک کی تقسیم سے قبل اور تقسیم کا منصوبہ تسلیم ہونے کے دوران اُنہوں نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ یونس صاحب کو ''فریڈم ایٹ مِڈنائٹ'' کے مصنفیں پر اتنا غصّہ آیا ہے کہ انہوں نے دی، پی، مینن کو بھی جی بھر کر کوسا ہے۔ انہوں نے حسنین صاحب کے متعلق کہا ہے کہ وہ محض ایک گھٹیا قسم کا کلرک تھا۔ لیکن مصنفین نے اِس کے ردل کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے، کہ جیسے وہ جواہر لال نہرو کے ہم پلہ ہو۔ پریس ایشیا انٹرنیشنل کے ایڈیٹروں کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے لارڈ مونٹ بٹین پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ دراصل اپنی زندگی

میں ہی اپنے بے مثال جنازے کی تیاری کرر ہے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے آپ کو ایک ایسا ہیرو بنانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ کہ جو ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنے یونس صاحب نے یہ انکشاف کیا ہے کہ لارڈ مونٹ بٹین نے ہندوستانی حکومت سے درخواست کی ہے کہ ان کے جنازے میں شرکت کے لئے دوسو سے زائد ہندوستانی افسر انگلستان بھیجے جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ فریڈم ایٹ مِڈ نائٹ کے مصنفین نے اپنی کتاب میں کچھ اہم نام نظر انداز کر دیئے ہیں۔ لیکن اس فروگذاشت پر اتنا برہم ہونے کی ضرورت نہیں، کہ جتنا یونس صاحب ہو رہے ہیں۔

۲۲ مئی ۱۹۷۶ء

پیرزادہ صاحب کا گناہ:-

موجودہ حکومت نے ریاستی انتظامیہ کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک و صاف کرنے کی جو مہم ایک سال قبل شروع کی تھی، اِس کی رفتار اتنی کم اور سست پڑ گئی ہے کہ اب کسی کو یاد بھی نہیں، کہ انتظامیہ کی تطہیر اس حکومت کا سب سے بلند بانگ دعویٰ ہی نہیں، اس کے وجود کا سب سے بڑا جواز بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ حکومت کی نگاہوں میں انتظامیہ اتنی صاف و پاک اور صاف وشفاف ہو گئی ہے کہ اب اس میں مزید صفائی کی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔ اور اگر میرا یہ قیاس صحیح نہیں، تو پھر ماننا پڑے گا کہ موجودہ قیادت اِس عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے میں اتنی بے بس ہے کہ اِس نے چند قدم چل کر ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے، آپ نے، حکومت نے، سب نے موجودہ حالات کے ساتھ

میں ہی اپنے بے مثال جنازے کی تیاری کرر ہے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے آپ کو ایک ایسا ہیرو بنانے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ کہ جو ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنے یونس صاحب نے یہ انکشاف کیا ہے کہ لارڈ مونٹ بٹین نے ہندوستانی حکومت سے درخواست کی ہے کہ ان کے جنازے میں شرکت کے لئے دوسو سے زائد ہندوستانی افسر انگلستان بھیجے جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ فریڈم ایٹ مِڈ نائٹ کے مصنفین نے اپنی کتاب میں کچھ اہم نام نظر انداز کر دیئے ہیں۔ لیکن اس فروگذاشت پر اتنا برہم ہونے کی ضرورت نہیں، کہ جتنا یونس صاحب ہور ہے ہیں۔

۲۲ مئی ۱۹۷۶ء

پیرزادہ صاحب کا گناہ:-

موجودہ حکومت نے ریاستی انتظامیہ کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک و صاف کرنے کی جو مہم ایک سال قبل شروع کی تھی، اِس کی رفتار اتنی کم اور سست پڑ گئی ہے کہ اب کسی کو یاد بھی نہیں، کہ انتظامیہ کی تطہیر اس حکومت کا سب سے بلند بانگ دعویٰ ہی نہیں، اس کے وجود کا سب سے بڑا جواز بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اربابِ حکومت کی نگاہوں میں انتظامیہ اتنی صاف و پاک اور صاف و شفاف ہوگئی ہے کہ اب اس میں مزید صفائی کی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔ اور اگر میرا یہ قیاس صحیح نہیں، تو پھر ماننا پڑے گا کہ موجودہ قیادت اِس عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے میں اتنی بے بس ہے کہ اِس نے چند قدم چل کر ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے، آپ نے، حکومت نے، سب نے موجودہ حالات کے ساتھ

سمجھوتہ کرلیا ہے ۔ اوراب انتظامیہ کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک وصاف کرنے کی بات ، کچھ Out of Context معلوم ہوتی ہے ۔ اب کچھ لوگوں کو صرف یہ بات یاد ہے ، کہ ایک سال قبل کچھ اعلیٰ آفیسروں کو کچھ دیر کے لئے او۔ ایس ۔ ڈی (آفیسران سپیشل ڈیوٹی) بنا دیا گیا تھا۔ اِن میں قادری صاحب اور رینزو صاحب تو مرکزی حکومت میں اچھے عہدوں پر تعینات ہوگئے ہیں ، بعض لوگوں کو او ۔ ایس ۔ ڈی بنانے کے بعد پہلے سے بھی اچھی جگہوں پر ''سجایا'' گیا ہے ، کچھ بے چارے اتنے گمنام اور کم گو تھے ، کہ وہ حاکمانِ وقت کے ذہن سے ہی اُتر گئے ہیں ۔ اور چند ایک ایسے ہیں کہ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ اربابِ اقتدار سے انصاف کے طلب گار ہیں ۔ افسروں کی اِس طویل فہرست میں اِس وقت میرے ذہن میں پیرزادہ غلام نبی کا نام آرہا ہے کہ جو پچھلے ایک سال سے بے کار پڑے ہوئے ہیں ۔ مجھے پیرزادہ صاحب کی ''ذاتی دیانت'' کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ، میں اِس حیثیت میں بھی نہیں کہ میں ان کی زندگی کے اِس پہلو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا...... لیکن میں ایک بات کی شہادت دینے کے لئے بالکل تیار ہوں ، کہ پیرزادہ صاحب ایک انجینئر کی حیثیت سے ہماری ریاست کے ایک اعلیٰ ترین اور ممتاز انجینئر ہیں ، ان کی قابلیت اور اہلیت کا اعتراف ، اِن لوگوں کو بھی ہے ، کہ جو کسی وجہ سے انہیں ناپسند کرتے ہیں ۔ میں یہ قسم کھانے کے لئے بھی تیار ہوں ، کہ وہ اپنے تجربے ، اپنی تعلیم ، اپنی اہلیت اور تربیت کے اعتبار سے اِن بہت سے دوسرے انجینئروں پر فوقیت رکھتے ہیں ، کہ جو اِس

رت برسر اقتدار ہیں، پیرزادہ صاحب کوکس جرم کی پاداش میں سزادی گئی ہے میں نہیں جانتا۔لیکن اگر اِن کا جرم یہ ہے کہ ان کی شہرت ٹھیک نہیں تھی۔ تو میں یہ جاننا چاہوں گا۔ کہ اِن سے زیادہ بُری شہرت رکھنے والے افسر اور انجینئر بڑے بڑے عہدوں پر کیوں براجمان ہیں؟ کیا اِس ریاست کے انتظامیہ سے ہر بُری شہرت رکھنے والے بدنام افسر کو نکال باہر کردیا گیا ہے، کہ جو پیرزادہ جیسے قابل، محنتی اور تجربہ کار کو سزادینا ضروری بن گیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پچھلے ایک سال کے دوران ایسے بددیانت اور بے ایمان افسروں کو بھی ترقی دی گئی ہے، کہ جن کے خلاف ریاستی ہائی کورٹ نے سخت ریمارکس پاس کئے ہیں؟...... پھر پیرزادہ جیسے گناہ گاروں کا کیا قصور ہے؟ میں پیرزادہ غلام نبی کی وکالت نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ میں یہ چاہوں گا کہ اگر انہوں نے ایسا کوئی جرم کیا ہے کہ جو برسر اقتدار انجینئروں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے، تو انہیں اِس جرم کی سخت سے سخت سزادی جانی چاہیئے۔لیکن صرف افواہوں اور بُری شہرت کے الزام میں، ریاست کو ایک بے حد قابل، تجربہ کار اور تربیت یافتہ انجینئر کی خدمات سے محروم کرنا، نہ انصاف کے تقاضوں کو پُورا کرتا ہے۔ اور نہ دانشمندی کے......اور جو بات پیرزادہ غلام نبی کے حق میں صحیح ہے، وہ اِن تمام افسروں پر بھی صادق آتی ہے کہ جنہیں صرف ان کی بُری شہرت کے پیشِ نظر معتوب اور مردود قرار دیا گیا ہے جس طرح بعض اوقات کسی انسان کی اچھی شہرت ہی اس کے اچھے ہونے کا حتمی ثبوت نہیں ہوتی، اِسی طرح کبھی کبھی صرف کسی کی بُری شہرت اِس کے بُرے

ہونے کی ناقابلِ تردید شہادت نہیں ہوتی!

☆

۲۹ مئی ۱۹۷۶ء

قبرستان کی خاموشی:-

ایمرجنسی کے بعد ملک بھر میں امن و امان کا جو ماحول قائم ہو گیا ہے۔ اس کا سب سے بھرپور اور نمایاں اظہار پارلیمنٹ کی روزمرہ کی کاروائی میں ہوتا ہے۔ وہی لوک سبھا جو بال کی کھال نکالا کرتی تھی اور معمولی سے معمولی مسئلے پر گھنٹوں نہیں بلکہ کئی کئی دن تک بحث و مباحثے کی محفلیں سجایا کرتی تھی، اب آئین میں ترمیم جیسے بلوں کو بھی چٹکیوں میں پاس کر دیتی ہے۔ آنجہانی للت نرائن مشرا سے وابستہ لائسنس سکینڈل پر جب پُورے اٹھارہ دن تک ہنگامہ آرائی ہوتی رہی تو ایک دن میں نے حساب لگا کر یہ انکشاف کیا کہ اِن لائسنسوں کی کل رقم ۱۲ لاکھ روپے ہے لیکن لوک سبھا نے اس پر بحث کرنے میں اب تک ایک لاکھ روپے صرف کر دیئے ہیں۔ یہ ان دنوں

کی بات ہے کہ جن کی یاد اب ایک خوبصورت خواب بن کر رہ گئی ہے اب
پارلیمنٹ کا یہ عالم ہے کہ سوالات کے گھنٹے کے بعد ایوان میں کورم کے بغیر
کاروائی چلتی ہے اور حکومت اور حزب مخالف (جو کچھ بھی ہے) کے درمیان
ایک خاموش مفاہمت طے پائی ہے کہ کوئی ممبر کورم کا سوال نہیں اُٹھائے گا۔
اِس مصیبت سے نجات پانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ اب کبھی کبھی ایوان میں
چار پانچ سے زیادہ ممبران نظر نہیں آتے، پچھلے ہفتے ایک مرحلے پر ایوان میں
صرف چار ممبر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک تقریر کر رہا تھا۔ دوسرا اسپیکر
کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ تیسرا اپنی سیٹ پر اونگھ رہا تھا اور چوتھا تقریر کرنے والے
ممبر کے بعد اپنی باری کا منتظر تھا۔ میں نے یہ عالم دیکھا، اور سنٹرل ہال میں
بیٹھے ہوئے کچھ ممبران کو بھی دعوت دی کہ وہ امن وسکون اور سکوت کا یہ نظارہ
دیکھ لیں۔ ایمرجنسی نے ملک کے ہنگامہ خیز ماحول میں یقیناً سکون اور سکوت
کی فضا قائم کر دی ہے لیکن اس خاموشی پر اب قبرستان کی سی خاموشی کا گمان
ہونے لگا ہے اور اس قسم کی خاموشی زندگی سے زیادہ موت کی غماز ہوتی
ہے۔ مسیحاؤ! اس خوفناک خاموشی کا کچھ علاج کرو۔

لہو کے پھول:۔

پچھلے دنوں راج گڑھ پولیس کے لان میں پھولوں کی جس نمائش کا
اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ اپنی خوبصورتی، نزاکت، رنگا رنگی اور حسنِ انتظام کی بنا پر
بہت دنوں تک یاد رکھی جائے گی، کشمیر کو بجا طور پر پھولوں کی وادی اور
پھولوں کی شہزادی کہا جاتا ہے۔ لیکن جاپان کے لوگ پھول اُگانے اور

سجانے کا جو قرینہ رکھتے ہیں، ہم اس سے محروم ہیں۔ اور ہمارے ہاں ابھی تک پھول اُگانے اور پھولوں سے دِل بہلانے کو امیروں اور رئیسوں کے شوقِ فضول سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے محکمہ جنگلات اور باغات کے اہتمام سے پھولوں کی تازہ نمائش دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شہر میں اِس قسم کی ایک مستقل نمائش قائم کی جانی چاہیے۔ فرانس کے شہر پیرس میں ایک پورا بازار ہی پھولوں کے لئے مخصوص ہے اور اِس بازار میں صبح سے شام تک لوگوں کا اژدہام رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم موسمِ بہار اور موسم گرما میں سرینگر میں بھی اِس قسم کا ایک چھوٹا موٹا بازار سجانے کی گنجائش ہے۔ میں چاہوں گا کہ محکمہ باغات کے افسران اور ملازم سرکاری باغات اور اپنے گھروں میں پھول اُگانے اور کیاریاں سجانے کے علاوہ عام لوگوں میں بھی اِس شوق کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ اور جن گھروں کے ساتھ چھوٹے باغیچے یا کچن گارڈن نہیں ہیں، وہ گملوں میں پھول اُگا کر یہ کمی پوری کر سکتے ہیں۔ پھولوں کی اِس نمائش میں بہت سے غریب مالیوں نے حسن ترتیب اور حسنِ انتخاب کے لئے انعامات حاصل کئے اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ محکمے کی طرف سے ان غریبوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ پھولوں کی اس نمائش کے سلسلے میں مجھے ایک اور بات کہنا ہے اور اِس کا تعلق پھولوں سے نہیں ہے۔ اِس قسم کی تقریبات پر کم سے کم اور مختصر سے مختصر تقریریں کی جانی چاہئیں پھولوں کی نسبت سے مجھے ایک لطیفہ یاد آیا جسے سنا کر میں یہ ذکر ختم کر رہا ہوں۔ یہ غالباً چھ سات برس پرانی بات ہے اور صادق صاحب مرحوم اِن

دنوں ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ ۵ پرتھوی راج روڑ نئی دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور میں ان کے ساتھ تھا۔ اس دوران حیات اللہ انصاری صاحب تشریف لائے۔ اور انہوں نے صادق صاحب کی خدمت میں اپنے ضخیم ناول ''لہو کے پھول'' کی تین یا غالباً چار جلدیں پیش کیں۔ دورانِ گفتگو حیات اللہ انصاری صاحب نے کہا کہ اس کا انگریزی ترجمہ شائع کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ یہ سن کر میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا کہ جی ہاں انگریزی میں ''لہو کے پھول'' کے لئے Bloody Fool کا لفظ موزوں رہے گا۔ میری اس گُستاخی بلکہ بدتمیزی پر صادق صاحب نے بڑے زور کا قہقہہ مارا، لیکن حیات اللہ انصاری صاحب نے جیسے میری بات سُنی ہی نہیں!

''شعلے'' میں کیا ہے؟:-

فلم ''شعلے''، نئی دہلی کے پلازا سنیما میں تیس ہفتوں سے چل رہی ہے اور ہر شو میں ہال کے باہر ''ہاؤس فل'' کا بورڈ نظر آتا ہے۔ فلم کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج تقریباً آٹھ ماہ بعد بھی فلم کے ٹکٹ بلیک میں فروخت ہو رہے ہیں۔ اور ملک بھر سے موصول ہونے والی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جگہ اِس فلم کی مقبولیت کا یہی زور و شور ہے۔ سرینگر جیسے شہر میں بھی یہ فلم پُورے کئی ماہ تک چلتا رہا۔ غرض فلم کی کامیابی اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ماہرین فلمیات کا کہنا ہے کہ اس نے آمدنی اور قبولِ عام کے لحاظ سے پُرانے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ فلم کے بارے میں اتنی ساری باتیں سُن کر میرے سمندِ شوق کو بھی تازیانہ لگا۔ اور میں نے پچھلے ہفتے ایک ٹکٹ خرید ہی

لیا۔اس شو میں بھی ہال کچھا کھچ بھرا تھا۔فلم شروع ہوا۔اور میں فلم دیکھتا گیا۔ میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کی گفتگو سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار ''شعلے'' دیکھ چکے ہیں۔کیوں کہ انہیں فلم کا ہر مکالمہ زبانی یاد تھا شروع شروع میں مجھے فلم خاصا دلچسپ لگا۔لیکن جُوں جُوں یہ آگے بڑھتا گیا، اس کی مضحکہ خیزی نُمایاں ہوتی گئی۔اور انٹرول کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔مختصر یہ کہ مجھے ''شعلے'' میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی کہ جو اس کی غیر معمولی مقبولیت اور بے پناہ کامیابی کا جواز قرار پائے۔یا ہوسکتا ہے کہ فلم میں کوئی ایسی بات ہو کہ جو میری سمجھ میں نہ آئی ہو!

رجنی پٹیل:۔

دہلی پردیش کانگریس کے پریزیڈنٹ رجنی پٹیل وادی میں اپنے ہفتہ بھر کے قیام کے بعد کل نئی دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔مسٹر پٹیل کو کانگریس کا سب سے بڑا چندہ جمع کرنے والا لیڈر مانا جاتا ہے اور وہ اپنی ذہانت، فطانت اور وکالت کے لئے ملک بھر میں مشہور ہیں۔آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ شیخ صاحب کی درخواست پر رجنی پٹیل نے شیر کشمیر میڈیکل انسٹی چیوٹ کا ٹرسٹی بننا منظور کرلیا ہے۔اور سرینگر سے دہلی روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انسٹی چیوٹ کے لئے کم سے کم ۲۵ لاکھ روپے جمع کریں گے۔شیخ صاحب اگر اسی طرح ہندوستان کے دو چار ''رجنی پٹیلوں'' کو اس اہم اور نیک کام میں دلچسپی لینے پر آمادہ کر سکے، تو پھر میڈیکل انسٹی چیوٹ

کے خواب کا ہماری زندگی میں ہی شرمندہ تعبیر ہونا یقینی ہے۔

☆

۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء

لندن کی چند یادیں

یہ میری تیسری لندن یاترا تھی۔ لیکن اب کی بار میں سیاحت کے لئے نہیں علاج و معالجہ کے لئے جا رہا تھا اور ایک اجنبی دیار میں تنہائی کا احساس مجھے بُری طرح ستا رہا تھا۔ لندن کے (Heathrow) ائرپورٹ پر انڈین ہائی کمیشن کے ایک افسر مسٹر سریندر بتراء اور مسز شنکر رینہ میرے منتظر تھے۔ پاسپورٹ اور کسٹم کی رسومات ادا کرنے کے بعد ہم شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ تو مجھے ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ لندن میں پچھلے کئی دنوں سے مسلسل بارشیں ہو رہی ہیں اور صبح شام بڑی سردی پڑتی ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی میرے ذہن میں کچھ پُرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ٹھیک تین سال قبل اسی شہر میں ڈاکٹر شنکر رینہ نے میری پذیرائی کی تھی اور ہم پورے دس دن تک لندن کی سڑکوں، ڈیپارٹمنٹ سٹوروں، سستے ریستورانوں اور سنیما ہاؤسوں میں رات گئے تک کچھ اس طرح گھومتے پھرتے رہے، کہ

جیسے ہمیں ایک ساتھ رہنے کا آخری موقعہ دیا گیا ہو اور ہم اس کا پورا پورا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ لندن کے اجنبی شہر میں شنکر سے میری یہ ملاقات، ہماری آخری ملاقات ثابت ہوگی اور تین سال کے بعد لندن کے ہوائی اڈے پر میرا استقبال کرنے کے لئے شنکر نہیں اس کی چہیتی اور لاڈلی بیوی چندرا ہوگی۔ کہ جسے بیوہ کہتے ہوئے میرا سارا وجود کانپ اُٹھتا ہے۔

لندن میں اب کی دفعہ کچھ زیادہ ہی گہما گہمی نظر آرہی تھی اور اس کا سبب تھا، برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ کی سلور جوبلی، جس کی باقاعدہ تقریبات اگرچہ جون کے پہلے ہفتے سے شروع ہونے والی تھیں۔ لیکن دو ہفتے قبل ہی سارے انگلستان پر سلور جوبلی کا جادو سوار ہو گیا تھا۔ اور چاروں طرف جوبلی کی دھوم تھی۔ بازار، سڑکیں، پارک اور چوراہے دلہنوں کی طرح سجائے گئے تھے۔ اور انگریز جو عام طور پر بہت سنجیدہ اور رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں، بڑے شگفتہ موڈ میں نظر آرہے تھے، دُکانیں، سلور جوبلی (Souvenirs) سے بھری پڑی تھیں اور ملکہ کی تصویروں والے جھنڈے چاروں طرف لہراتے نظر آرہے تھے، دُنیا بھر سے سیاح لوگ سلور جوبلی کی تقریبات دیکھنے کے لئے لندن وارد ہورہے تھے، اور ایک اندازے کے مطابق جون کے پہلے ہفتے تک آٹھ سے دس لاکھ سیاحوں کی آمد متوقع تھی۔ لندن کے بازاروں اور ڈیپارٹمنٹ سٹوروں میں ویسے بھی صبح سے شام تک خریداروں کا ہجوم رہتا ہے۔ لیکن اب کی بار لوگوں کی اتنی کثرت تھی کہ اس سے پہلے میں نے

کبھی نہیں دیکھی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے لندن شہر کے بڑے بڑے سٹورز میں عربی زبان میں ہدایات اور معلومات آویزاں دیکھیں، اس سے اندازہ ہوا کہ عرب ممالک سے آنے والے سیاحوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اور برطانیہ کے تاجران کی طرف خصوصی توجہ دے رہے ہیں۔ ۴ جون کو سلور جوبلی کی تقریبات اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئیں، اس دن ملکہ ایلزبتھ ایک سنہری بگھی میں سوار ہو کر لندن کے بڑے بڑے بازاروں اور شاہراؤں سے گذرنے والی تھیں اور ملکہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے برطانیہ کے کونے کونے سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ لندن وارد ہو گئے تھے۔ ۳ جون کی رات کو جب میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ بکھنگھم پیلس کی طرف گیا۔ تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ پیلس کی طرف جانے والی ہر سڑک کے فٹ پاتھ پر ہزاروں لوگ ابھی سے دوسرے دن کی صبح کے لئے منتظر بیٹھے تھے۔ اور ان میں بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سبھی شامل تھے، سردی اور بارش کے پیش نظر اکثر لوگ لحاف اور چھاتے ساتھ لائے تھے، اور جگہ جگہ گانے بجانے کی محفلیں آراستہ تھیں۔ میں نے کئی بار ۲۶ جنوری کے موقعے پر دلی میں ہزاروں لوگوں کو راج پتھ پہ رات گذارتے دیکھا ہے۔ اور میرا خیال تھا کہ ذوقِ تماشا کی یہ جنونی کیفیت صرف ہم ہندوستانیوں تک ہی محدود ہے۔ لیکن لندن کی اُس بھیگی اور ٹھنڈی رات کو ہزاروں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کو فٹ پاتھوں پر ٹھٹھرتے دیکھ کر میں نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ انسان انگریز ہو یا جرمن، ہندوستانی ہو یا جاپانی اس کی فطرت ایک

ہے۔ ملکہ کی سواری دوسرے دن ۴ جون کو ساڑھے دس بجے پیلس سے نکلنے والی تھی اور اس دن جب میں نو بجے کے قریب دھکے کھاتا، اور دھکے دیتا ہوا بلھنگھم پیلس کے قریب پہنچ گیا۔ تو کہیں تلِ دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ایک امریکی سیاح کی مہربانی سے مجھے پیلس کے بالکل سامنے تھوڑی سی جگہ مل گئی اور میں نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں پر دیوانگی کا عالم طاری ہوتے دیکھا ۔امریکی سیاح نے مجھے بتایا کہ وہ آدھی رات کے وقت سے وہاں کھڑا ہے، اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ صرف ملکہ کو دیکھنے کے لئے آپ نے اتنی زحمت کیوں گوارا کی۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ یہی سوال تو میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔'' میرے پاس اس سوال کا نہ تب کوئی جواب تھا اور نہ اب ہے۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے ملکہ اپنی سنہری بگی میں اپنے سرتاج کے ہمراہ پیلس سے نکلیں تو انگریز ملکہ کی ایک جھلک دیکھ کر فرطِ مسرت سے اس طرح ناچنے لگے، کہ جیسے انہیں دوکونین کی دولت مل گئی ہو۔ ہر انگریز، بلکہ ہر تماشائی کے ہاتھ میں کاغذی یونین جیک کی ایک جھنڈی تھی جس پر ملکہ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اور جونہی ملکہ کی سواری گذرتی تو لوگ جھنڈیاں ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتے، رات بھر بارش ہوتی رہی تھی۔ لیکن ملکہ کا جلوس نکلتے وقت مطلع صاف ہو گیا اور اس کی سواری شاہراؤں سے گذرتی ہوئی چرچ پہنچ گئی۔ ایک اندازے کے مطابق آٹھ سے دس لاکھ لوگوں نے ملکہ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کا یہ شاہی جلوس دیکھا اور اس دن رات کو

سارے شہر میں چراغاں ہوا۔ میں بکھنگھم پیلس سے سیدھا اپنی قیام گاہ پر گیا اور ٹیلی ویژن پر انگریزوں کی ملکہ پرستی کے نظارے دیکھتا رہا۔ شاہی جلوس کے دوران بعض مقامات پر ملکہ اپنی بگی سے نیچے آ گئیں اور سڑک کے دونوں طرف کھڑے لوگوں سے ہاتھ ملایا۔ یہ منظر دیکھنے والا تھا۔

برطانیہ میں چار ہفتوں کے دوران مجھے بی بی سی پر ڈیوڈ فراسٹ اور سابق امریکی صدر مسٹر رچرڈ نکسن کے تین انٹرویو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہ تینوں انٹرویو دیکھ کر صدر نکسن کے ساتھ میری رہی سہی ہمدردی بھی ختم ہوگئی۔ ڈیوڈ فراسٹ اپنی بے باکی اور بے رحمانہ نشتر زنی کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس نے نکسن پر اس بے رحمی سے جرح کی کہ مجھے بے چارے نکسن پر ترس آنے لگا۔ اور آخری انٹرویو میں فراسٹ نے اس کی وہ گت بنائی کہ بے چارا نکسن پسینے پسینے ہوگیا۔ چلّی کے سوال پر فراسٹ کے تابڑتوڑ حملوں کی تاب نہ لا کر نکسن اس قدر گھبرا گیا کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ یا تو بھاگ جائے گا، یا فراسٹ کو گالی دے کر اپنے گھر سے نکل جانے کو کہے گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور اسے چار و ناچار ہر سوال کا جواب دینا ہی پڑا۔ اس کے بعد مجھے ڈیوڈ فراسٹ کے دو اور انٹرویو دیکھنے کا بھی موقعہ ملا۔ ایک میں اُس جرمن مصنف سے مکالمہ تھا کہ جس نے اپنی ایک تازہ تحقیقی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہٹلر کا یہودیوں کو ختم کرنے یا ان پر مظالم ڈھائے جانے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور یہودیوں کے ساتھ ہٹلر کے دور اقتدار میں جو کچھ ہوا، اس کا ہٹلر کو کوئی علم نہیں تھا۔ ڈیوڈ فراسٹ کے اس

پروگرام میں جرمنی اور ہٹلر کے حامی نوجوان مصنف اور ان مصنفوں کے درمیان وہ گرما گرمی ہوئی کہ مزا آ گیا۔ اور ڈیوڈ فراسٹ نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ پروگرام کنڈکٹ کیا۔ جب نوجوان مصنف نے یہ دعویٰ کیا کہ ہٹلر چرچل اور ٹرومین کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور دیانتدار آدمی تھا۔ تو سامعین میں سے کچھ لوگوں نے اس پر فقرے کسنا شروع کر دیئے۔ لیکن مجال ہے کہ اس نوجوان کی جارحیت میں کوئی فرق آیا ہو۔

ڈیوڈ فراسٹ کے دوسرے پروگرام میں آسٹریلیا کے اس دولت مند تاجر مسٹر پیکر پر جرح ہوئی کہ جس نے آسٹریلیا میں کرکٹ سرکس کا اہتمام کر کے کرکٹ کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس پروگرام میں مسٹر پیکر کا پلہ بھاری رہا اور ڈیلی میل کے ایڈیٹر کی وہ درگت بنی کی خدا کی پناہ، سامعین نے مسٹر پیکر کے ایک ایک فقرے پر داد دی اور اس پر جرح کرنے والے اپنا سامنہ لے کے رہ گئے۔

ڈیوڈ فراسٹ کے پروگرام دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ اگر اپنے ہاں بھی اس قسم کے پروگرام پیش کئے جائیں۔ تو ٹیلی ویژن کی اہمیت اور مقبولیت میں کتنا اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اپنے ہاں کے سیاستدان اس قسم کی نشتر زنی برداشت کر سکتے ہیں۔ لندن میں میرے قیام کے دوران آکسفورڈ سرکس کے ایک سمینا ہال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر بنی ہوئی مشہور فلم The Massage بیک وقت انگریزی اور عربی زبان میں چل رہی تھی۔ میں نے اس فلم کے حق میں اور خلاف بہت سی باتیں سنی

اور پڑھی تھیں ۔ میرے ایک دوست عبدالمجید ترالی نے یہ فلم دیکھی تھی اور انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی ۔ ایک شام میں بھی یہ فلم دیکھنے گیا۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر بنے ہوئے اس فلم کے خلاف جو واویلا کیا جارہا ہے ۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ فلم میں نہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ دکھائی جاتی ہے اور نہ ان کی آواز ، حضرت علی کا بھی صرف سایہ ہی دکھایا جاتا ہے ۔ البتہ انتھونی کوین نے حضرت حمزہ کا رول ادا کیا ہے اور اسے بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ اس فلم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی اور اسلام کے پھیلنے کی کہانی بہت ہی فن کارانہ انداز میں پیش کی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سے غیر مسلموں میں اسلام کے متعلق بہت سے توہمات اور تعصّبات دور ہوں گے...... ٹکنیکی اعتبار اس فلم کا شمار دنیا کی بہترین فلموں میں ہوسکتا ہے اور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ یہ فلم بے جا طور پر بحث ونزاع کا موضوع بن گئی ہے۔

۲۱ دسمبر ۱۹۷۶ء

ونود کمار......انسان دوستی کی یادگار

میں پچھلے ماہ کی ۲۷ تاریخ کو اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر دہلی پہنچا، تو سری کنٹھ میرے گھر کے آنگن میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا ونود کمار بھی تھا۔ اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ دو دن سے میرے انتظار میں یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ونود کو دل کی بیماری ہے اور ڈاکٹر علی محمد جان نے سری کنٹھ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی چیوٹ میں اس کا ملاحظہ اور علاج کروائے۔ ڈاکٹر جان نے خاص طور پر انسٹی چیوٹ میں امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹر ٹنڈن سے مشورہ کرنے کی ہدایت بھی کی تھی، میں نے اسی وقت ڈاکٹر ٹنڈن کو فون کیا، تو انہوں نے دو دن بعد کا ''اپارٹ منٹ'' دیا میں نے سری کنٹھ سے پوچھا کہ اس نے اپنی رہائش کا کیا انتظام کیا ہے۔ تو اس نے مجھے بتایا، کہ میڈیکل انسٹی چیوٹ کے نزدیک ہی ایک دھرم شالہ میں اسے سر چھپانے کی

جگہ مل گئی ہے۔ میں نے اسے دو دن بعد میڈیکل انسٹی چیوٹ کے بیرونی دروازے پر وقت مقررہ پر میرا انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ وہ چلا گیا، تو میں امورات خانہ داری میں اُلجھ کر سری کنٹھ اور اس کے بیٹے ونود کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔

سری کنٹھ بالی شوپیان کا رہنے والا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، شوپیان میں اِس کی ایک سبزی کی دُکان ہے لیکن اس کے باوجود وہ میرے نام میرے ایک دوست کا سفارشی خط لایا تھا۔ دہلی میں قیام کے دوران میرے پاس چونکہ اس قسم کے مریض آتے رہتے ہیں۔ اوران کی رہبری اور رفاقت کے سلسلے میں جو کچھ مجھ سے ہوسکتا ہے وہ میں کرتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ میں ڈاکٹر ٹنڈن سے ونود کا ملاحظہ کروا کر اسے انسٹی چیوٹ میں داخل کرادوں گا۔ اوراس طرح اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوااور مجھے ونود کے باپ کے غم میں صرف خود ہی نہیں، سارے ملک کو شریک کرنا پڑا۔ دو دن بعد میں وقت مقررہ پر آل انڈیا انسٹی چیوٹ پہنچا تو ونود اپنے باپ کے ہمراہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ غور سے ونود کو دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آئے۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں میں ایک نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ شکل وصورت سے تندرست نظر آرہا تھا۔ لیکن سری کنٹھ نے مجھے بتایا کہ وہ پانچ دس قدم سے زیادہ چل نہیں سکتا۔ اور اس کے بعد اس کی سانس پھولنے لگتی ہے۔ ونود کی عمر دس سال کے لگ بھگ ہوگی، اور میں نے

دِل ہی دل میں سوچا، کہ اس کم عمری میں اسے دل کا عارضہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ شاید اور کوئی بیماری ہو، اور ڈاکٹر جان کی تشخیص غلط ثابت ہو جائے۔

شام کے چار بجے ڈاکٹر ٹنڈن نے ونود کا ملاحظہ کیا، اس سے پہلے کچھ دوسرے ڈاکٹروں نے بھی اسے بغور دیکھا تھا۔ اور ایک ڈاکٹر نے اس کا ای۔ سی۔ جی بھی اُٹھالیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک ونود کا ملاحظہ کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹنڈن نے یہ رائے ظاہر کی اس کے دل کا آپریشن کرنا پڑے گا۔

کیونکہ ان کے خیال میں دل کا ایک Valve پیدائش سے ہی خراب ہے اور دل کھول کر اسے بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں...... میں نہیں جانتا کہ سری کنٹھ کو اس وقت اپنے بیٹے کی بیماری کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہوا یا نہیں، لیکن وہ اس بات سے مطمئن نظر آتا تھا کہ اس کا بیٹا لاعلاج نہیں۔ ڈاکٹر ٹنڈن نے ہدایت کی کہ اب ہم ڈاکٹر اگروال سے مل لیں جو ونود کے داخلے اور آپریشن کا انتظام کریں گے۔ سری کنٹھ اور ونود کو ڈاکٹر اگروال کے کمرے کے پاس چھوڑ کر میں گھر چلا آیا۔ اور انہیں ہدایت کی کہ وہ مجھے شام کو ٹیلی فون پر وارڈ نمبر اور بیڈ نمبر بتادیں تاکہ میں دوسرے دن انہیں دیکھنے کے لئے آؤں......

مجھے اس بات کا یقین تھا کہ ونود کو انسٹی چیوٹ میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور اس کا علاج معالجہ شروع ہو جائیگا۔ میر اندازہ غلط ثابت ہوا۔

شام کو سری کنٹھ ونود کو لے کر پھر میرے ہاں آیا اور میں نے محسوس کیا کہ صرف چند گھنٹوں کے اندر ہی اندر اس کی کیفیت کچھ سے کچھ ہو گئی تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ونود کی بجائے اسے خود دل کی بیماری لگ گئی ہے اس کی

آنکھوں میں آنسو تھے۔ اوراس نے مجھے گلوگیر آواز میں بتایا کہ ونود کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ کیونکہ ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپریشن کے لئے دس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی۔ میں نے اسی وقت ڈاکٹر اگر وال کو ٹیلی فون کیا...... توانہوں نے اس بات کی تصدیق کی۔ ڈاکٹر اگروال نے مجھے بتایا کہ یہ Open Heart Surgery کا کیس ہے اور اس میں کچھ چیزیں بیرون ممالک سے درآمد کرنی ہیں۔ اور بعض ادویات بازار سے خریدنا پڑیں گی اور جہاں تک میڈیکل انسٹی چیوٹ کا تعلق ہے...... وہاں اس سے کوئی فیس وصول نہیں کی جائیگی ...... ڈاکٹر اگروال نے کہا کم سے کم دس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی ...... اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں...... میں نے ایک بار پھر ونود کی طرف دیکھا...... اور میں اس کی معصومیت اور پیارے پن پر موت کا سایہ لہراتے ہوئے دیکھ کر کانپ گیا۔ میری بیوی اور بچوں نے یہ سارا احوال سنا، تو سارے گھر پر اُداسی چھا گئی۔ دس ہزار روپے کی رقم بہت زیادہ نہیں لیکن چیل کے گھونسلے میں مانس کہاں؟ میں نے کچھ جھوٹی تسلیاں دے کر سری کنٹھ اور ونود کو اپنی رہائش گاہ پر بھیج دیا...... اور میں خود اس اُلجھن میں پڑ گیا...... کہ دس ہزار روپے کی یہ رقم کہاں سے آئے گی...... میں نے سری کنٹھ کا دل رکھنے کے لئے کہا تھا کہ تم فکر نہ کرو۔ پیسے کا کچھ انتظام ہو جائے گا...... لیکن یہ انتظام کہاں سے ہوگا اور کیوں ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے دن عید تھی۔ اور اس دن ہم قربانی کرنے والے تھے...... بیوی نے مشورہ دیا کہ ہم قربانی نہیں کریں گے۔ اور یہ روپے ونود

کے علاج کے لئے دیں گے...... میں نے بیوی کا مشورہ مان لیا...... لیکن ڈیڑھ سو روپے اور دس ہزار میں ابھی زمین اور آسمان کا فاصلہ تھا...... میرے ذہن میں آیا، میں شیخ صاحب اور فاروق صاحب دونوں کو ٹیلی فون پر یہ درخواست کروں کہ وہ اب کی بار عید قربان پر جمع ہونے والی قربانی کی کھالیں ونود کمار کی زندگی بچانے کے لئے دیں...... لیکن پھر نہ معلوم کیا سوچ کر یہ ارادہ ترک کر دیا...... میں رات بھر اس اُلجھن میں مبتلا رہا...... اور دوسرے دن علی الصبح مرکزی وزیر صحت ڈاکٹر کرن سنگھ کو فون کیا کہ شاید وہ کوئی مدد کر سکیں۔ لیکن بدقسمتی سے دن بھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ شام کو انڈین ایکسپریس کے کلدیپ نیر عید کی مبارکباد دینے کے لئے میرے گھر آئے۔ تو میں نے ان سے بھی اپنی اُلجھن کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں بھی کچھ مدد کروں گا۔ اور اپنے دو تین دوستوں سے بھی کہوں گا اور اس طرح تین چار ہزار روپے کی رقم جمع ہو جائے گی۔ لیکن ہمیں کم سے کم دس ہزار روپے کی ضرورت تھی اور میں نے نیر صاحب سے پوچھا کہ کیا ان کا اخبار اس معاملے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں انڈین ایکسپریس یہ بیڑا اُٹھانے کے لئے تیار ہے۔ دوسرے دن کلدیپ نیر صاحب نے اپنے ایک نمائندے اشونی سرین کو سری کنٹھ سے ملنے کے لئے دھرم شالے میں بھیج دیا اور تیسرے دن انڈین اکسپریس کے صفحہ اوّل پر "کیا ونود کا مرنا ضروری ہے" کے عنوان سے سری کنٹھ کا ایک انٹرویو شائع ہوا اور اس کے ساتھ ہی ونود کی تصویر۔ مسٹر اشونی سرین نے نہایت جذباتی انداز میں ونود

کے باپ، سری کنٹھ کا المیہ پیش کیا تھا۔

☆

۲۴ دسمبر ۱۹۷۶ء

ونود کمار (۲)

انسان دوستی کی یادگار:۔

مسٹر اشونی سرین نے نہایت جذباتی انداز میں ونود کے باپ سری کنٹھ کا المیہ پیش کیا تھا۔ اور بڑے فن کارانہ انداز میں اپنے پڑھنے والوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ ونود کو بچانے کے لئے اسے مالی امداد کریں۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کی انسانیت اور ان کی انسان دوستی پر زیادہ اعتماد نہیں ہے۔اس لئے مجھے اس بات کی اُمید نہیں تھی کہ ''انڈین ایکسپرس کی اپیل کا کوئی خاطر خواہ اثر ہوگا...... لیکن ایک بار پھر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔اسی دن دوپہر کو کلدیپ نیر نے مجھے فون پر کہا کہ لوگ انڈین ایکسپریس کے دفتر میں دھڑا دھڑ فون کر رہے ہیں۔ کہ وہ پیسہ کہاں بھیجیں؟ اس دن شام کو تین ہزار سے زیادہ کی رقم جمع ہو چکی تھی۔اور بہت سے لوگ دھرم شالے میں ذاتی طور ونود کو دیکھنے اور اس کے باپ کو ہر ممکن امداد کا یقین دلانے کے لئے جانے لگے۔ دوسرے دن ڈاکٹر کرن سنگھ نے وہیں سے فون کیا۔اور کہا کہ

میری وزارت بھی تین ہزار رروپے دینے کے لئے تیار ہے۔ وزارت اطلاعات کے وزیر دویا چرن شکلا نے ڈاکٹر ٹنڈن کو خط لکھا کہ وہ ونود کمار کے آپریشن کا کچھ حصہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ پروفیسر ڈی پی دت ایم پی نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ ونود کی زندگی کو بچانے کے لئے ملک کے اُستاد پیسہ جمع کریں گے...... انڈین ایکسپرس کے دفتر میں دھڑا دھڑ عطیات موصول ہونے لگے......اور اخبار نے اعلان کیا کہ ونود کمار کے لئے دس ہزار روپے سے زیادہ رقم جمع ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی انسانی مروت اور ہمدردی کے چشمے پھوٹتے رہے اور چند دنوں کے اندر اندر پچاس ہزار روپے سے زیادہ رقم جمع ہو گئی......اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ ونود کی زندگی بچانے کی اس مہم میں امیروں، غریبوں، ہندوؤں، مسلمانوں سبھی نے برابر کا حصہ لیا......اور انڈین ایکسپریس میں چندہ دینے والوں کی فہرست کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ چندہ دینے والوں میں پانچ روپے سے لے کر دس ہزار روپے تک دینے والوں کے نام شامل ہیں۔ سفرنگ موزز کے غلام محی الدین نے دس ہزار روپے کی رقم دے کر کشمیر کے سرمایہ داروں کی لاج رکھ لی......

ونود کمار کے لئے صرف دس ہزار روپے کی ضرورت ہے......لیکن ایک اندازے کے مطابق ابھی تک مختلف ذرائع سے تقریباً ایک لاکھ روپے جمع ہونے کی توقع ہے......میں نے انڈین ایکسپریس کو یہ مشورہ دیا ہے...... کہ وہ جمع شدہ رقم میں سے ونود کے اخراجات تفریق کر کے باقی رقم کو ایک

مستقل امدادی فنڈ کی شکل دیں تا کہ اس سے ان غریب اور بے آسرا لوگوں کی مدد کی جا سکے۔ کہ جنہیں ونود کمار کی طرح OPen Surgery کی ضرورت ہو ...... اور جو اس کے لئے ضروری اخراجات برداشت کرنے کی طاقت سے معذور ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میری یہ تجویز قبول کر لی جائے گی...... اور اس طرح سری کنٹھ کا ذاتی غم ایک آفاقی دردمندی میں بدل جائیگا اور بہت سے ونود کمار اس سے فیضیاب ہو سکیں گے۔

ونود کمار کی زندگی بچانے کے لئے ملک کے امیروں اور غریبوں نے جس ہمدردی اور انسان دوستی کا ثبوت دیا ہے...... اس سے انسانیت پر میرا ختم ہوتا ہوا وشواس پھر بحال ہو گیا ہے...... ہم میں اور بہت سی کمزوریاں ہیں لیکن ایسا ہوتا ہے کہ انسانی جان بچانے کے لئے ہم میں قربانی اور ایثار کا جذبہ ابھی زندہ ہے...... اور موجودہ حالات میں یہ ایک اچھا شگون ہے......

اب صرف ایک مسئلہ ہے اور وہ ہے ونود کمار کے آپریشن کی کامیابی کا...... یہ آپریشن اسی ماہ ہو گا ...... اور یہ اپنی نوعیت کا بہت ہی نازک اور مشکل آپریشن ہے۔ دُعا کیجئے کہ آپریشن کامیاب ہو۔ اور ونود کمار انسانی محبت خلوص اور ایثار کی ایک یادگار کے طور پر کم از کم سو سال تک زندہ رہے۔

۱۶ نومبر ۱۹۷۶ء

کنول کا پھول (۱)

شنکر رینہ ڈاکٹر تو تھے ہی، لیکن وہ ایک اچھے کہانی نگار اور ڈرامہ نویس بھی تھے۔ ان کی کہانیوں کا عنوان اور ان کے ڈراموں کا انجام ہمیشہ غیر متوقع اور چونکا دینے والا ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی کہانیاں اس نقطے پر آ کر ختم کر دیتے کہ جہاں پہنچ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ اب اصل کہانی شروع ہونے والی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی اور اپنی جدوجہد کے ڈرامے کے ساتھ بھی یہی کیا۔ عین اس مرحلے پر کہ جب ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کی اصل زندگی کا اب آغاز ہوتا ہے۔ اس نے ایک منجھے ہوئے کلاکار کی طرح اس کہانی کو اس ڈرامائی طریقے پر ختم کر دیا کہ ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ شنکر کی کہانی شروع کہاں سے کی جائے اور اس کو ختم کہاں سے سمجھا جائے۔ اس وقت جبکہ میں کہانی کار شنکر کی یہ کہانی لکھنے بیٹھا ہوں۔ اس کی بے قرار، مضطرب اور چٹانوں سے ٹکرانے کی خواہشمند روح اس کے جسم

کو چھوڑ کر اجنبی فضاؤں میں تحلیل ہو چکی ہے۔ لیکن اس کا جسم زخموں سے چور لندن کے اُس ہسپتال میں اپنے وطن لوٹنے کے لئے بے قرار ہے کہ جہاں اس نے سینکڑوں مریضوں کے زخموں پر مرہم رکھ کر اُنہیں زندگی بخشی ہے۔ ڈرامہ نویس شنکر کی زندگی کا یہ پہلو بھی کتنا عبرت ناک ہے کہ اپنے وطن کی خاک کے ایک ایک ذرے سے محبت کرنے والے کو اس خاک میں ملنے کے لئے بھی ابھی نہ معلوم کتنے دن انتظار کرنا پڑے گا۔ نہ معلوم مجھے اس بات کا یقین سا کیوں ہے کہ جب انڈین ائر لائنز کا طیارہ اس کی لاش کو لے کر سرینگر کے ہوائی اڈے پر اُترے گا، تو شنکر ایک لمحے کے لئے آنکھیں کھول کر یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ اس کے استقبال کے لئے کون کون آیا ہے اس نے اپنی ساری زندگی اس جدوجہد میں گذاری کہ اس کے ہم وطن اس کی شخصیت، اس کی صلاحیت، اس کے منصب اور مرتبے کو تسلیم کر لیں۔ اور ۳۰ سال کی ان تھک، مسلسل اور جان لیوا محنت اور ریاضت کے بعد جب وہ اپنی چھاتی پر اپنی فتوحات کے تحفے سجا کر اہل وطن سے داد اور خراج وصول کرنے کے لئے آ رہا تھا، تو بے رحم موت نے اس کے خوابوں پر شب خون مارا کہ اس کی یہ اکلوتی خواہش بھی پوری نہ ہونے دی۔ موت کی بے رحمی اور سفا کی کا (افسانہ) اتنا پُرانا ہے کہ اس پر تعجب اور تاسف کا اظہار بھی ایک رسم بن گئی ہے۔ لیکن شنکر رینہ کی بے وقت اور بے رحم موت نے خدا کی خدائی اور اس کے انصاف پر میرے ایمان کو کچھ دیر کے لئے متزلزل کر دیا۔ بے چارے غالب پر بھی اس کے چہیتے عارف کی موت پر کچھ ایسی ہی کیفیت

گذری ہوگی کہ اُنہیں کہنا پڑا ۔

ہاں اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور!

ڈاکٹر شنکر رینہ کی عمر چالیس سال سے کچھ کم ہی تھی اور انہوں نے اپنی زندگی میں ابھی کوئی ایسا غیر معمولی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا کہ جسے یاد کر کے انہیں بہت دنوں تک یاد رکھا جائے ۔ وہ ان ہزاروں ڈاکٹروں میں سے ایک تھے کہ جو پچھلے پندہ بیس سالوں کے دوران ہمارے مدرسوں میں تراشے گئے ہیں، وہ ایک اچھے کہانی نگار اور کامیاب ڈرامہ نویس ضرور تھے ۔ لیکن ان کی ٹکر اور مرتبے کے اور بھی بہت سے کہانی کار اور ڈرامہ نگار کشمیری زبان میں موجود ہیں اور اس کے باوجود اگر ان کی بے رحم اور بے وقت موت پر ان کے جاننے اور ماننے والے آج خون کے آنسو رو رہے ہیں ۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کنول کا یہ پھول ابھی پوری طرح کھلا نہیں تھا اور عین اُس وقت جبکہ یہ پھول کھل کر چاروں طرف اپنی مہک بکھیرنے والا تھا ۔ گلچین نے اسے شاخ گل سے توڑ کر اپنی بے رحمی اور بد ذوقی کا وہ دست مظاہرہ کیا کہ جس پر ہمیں صرف افسوس ہی نہیں سخت ناراضگی بھی ہے ۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شنکر رینہ کون تھا ۔ اس کا حسب نسب کیا تھا اور اس کی ابتدائی تربیت کس نے کی اور کہاں ہوئی اس کا سب سے بڑا قصور اور اس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک ایسے غریب، گمنام اور حقیر گھرانے میں جنم لیا تھا کہ جہاں جنم لے کر کوئی شخص ڈاکٹر تو کیا کمپونڈر اور خدمت گار

بننے کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ غریب شنکر کے غریب باپ کی یہ خواہش تھی
کہ شنکر روپے ڈیڑھ روپے یومیہ کی مزدوری کر کے گھر کا چولہا جلائے رکھنے
میں اس کی مدد کرے۔ لیکن خود شنکر کے سینے میں ایک اور ہی آگ دہک رہی
تھی اور یہ آگ اُسے ساری زندگی جلاتی رہی۔ وہ باپ کی مرضی، حالات
کے تقاضوں اور گھریلو مصلحتوں سے بغاوت پر آمادہ اپنی غربت، اپنے
افلاس اور اپنے سماج سے انتقام لینے کے لئے کمربستہ ہوا اور اس راہ میں اس
پر کیا کچھ گذری یہ ایک ایسی داستان ہے کہ جسے سن کر بہت سے بے حوصلہ اور
بے ہمت مایوس اور نا اُمید نوجوانوں کے ذہنوں میں اُمید اور آرزوں کے
چراغ بھی روشن ہو سکتے ہیں اور ہمارے موجودہ سماجی ڈھانچے کی بے ہودگی
اور فرسودگی کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے کئی بار
شنکر کی زبانی یہ روح فرسا اور خون رُلانے والی داستان سننے کا موقعہ ملا
ہے۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنی زندگی کی خوف ناک کشمکش کا یہ احوال
سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ ڈاکٹری کی ٹریننگ تو بہت
بعد کی بات ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے لئے شنکر کو کیا کیا پاپڑ بیلنے
پڑے ہیں۔ ان کے تصور سے بھی میری روح لرز جاتی ہے۔ اپنی زندگی کو
موجودہ ڈگر پر لانے کے لئے مجھے بھی زہر کے بڑے بڑے تلخ جام پینے
پڑے ہیں لیکن شنکر نے جن مسائل اور مصائب کا سامنا کیا ہے۔ ان کے
مقابلے میں میری اپنی جدوجہد اتنی ہیچ اور آسان نظر آتی ہے کہ شنکر رینہ
فولادی عزم والا ایک ایسا غیر معمولی مجاہد نظر آتا ہے کہ جسے بجا طور پر

نوجوانوں کی موجودہ نسل کے لئے ایک روشن ترین مثال کا رتبہ حاصل ہونا چاہیئے۔ ماں باپ کی دولت، خاندانی رسوخ اور تحفے تحائف کے سہارے ڈاکٹری سیٹیں حاصل کرنے اور امتحان پاس کرنے والوں کی اس شہر میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن صرف اپنی قوت ارادی اور اپنی جدوجہد کے بل بوتے پر آگے بڑھنے والے شنکروں کی تعداد انگلیوں پر ہی گنی جاسکتی ہے اور حق بات یہ ہے کہ مجھے اس سلسلے میں شنکر رینہ کے علاوہ کسی دوسرے شنکر کا علم بھی نہیں (یہ بات میں شنکر رینہ کی تعریف میں نہیں۔ اپنی لاعلمی کی بناء پر کہہ رہا ہوں)

شنکر کا خیال تھا کہ ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کی ساری مصیبتیں اور اس کے سارے مسائل حل ہوجائیں گے۔ لیکن ایم۔بی۔بی۔ ایس کی ڈگری بھی اسے وہ سماجی رُتبہ اور عزت دینے میں ناکام ہوئی، کہ جس کے حصول کے لئے اس نے اپنے لڑکپن اور اپنی جوانی کا لہو جلایا تھا۔ اسے جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ جس سماج میں اس نے جنم لیا ہے۔ وہاں تعلیمی قابلیت اور تخلیقی صلاحیتوں سے زیادہ خاندانی وجاہت اور دولت وحشمت کا حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔ اپنی اس محرومی کو دور کرنے کے لئے اب شنکر نے بے تحاشہ روپے کمانا شروع کیا اور اپنی خداداد ذہانت، بے پناہ محنت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے سہارے اس نے کم سے کم عرصے میں پہلے ایک موٹر کار خریدی۔ اس کے بعد مکان کے لئے زمین اور پھر مکان کی تعمیر شروع کردی۔ ایک طرف تعمیر کا یہ سلسلہ جاری تھا اور دوسری طرف اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں بھی ایک نکھار آگیا۔ اس زمانے میں اس نے کچھ بہترین

کہانیاں اور چند کامیاب ڈرامے لکھے۔ اسکی ان کہانیوں سے سماج کی مصنوعی قدروں اور زمانے کے فرسودہ معیاروں پر گہرا طنز ہوا کرتا تھا۔ اور اپنے اکثر ڈراموں میں وہ ہماری زندگی کے ان تضادات کا مضحکہ اُڑایا کرتا تھا کہ جن کی بدولت ہمارا سارا معاشرہ ایک ایسی سڑی گلی لاش کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ کہ جس کے ایک ایک عضو سے عفونت اور بدبو آرہی ہے۔ شنکر اپنی زندگی کے اسی تضاد کو دور کرنے کی کوششوں میں دن بدن نئے نئے تضادات کا شکار ہوتا رہا اور یہی ہم سب کی زندگی کا المیہ ہے۔

۱۷نومبر ۱۹۷۶ء

کنول کا پھول (۲)

شنکر رینہ سے میری پہلی جان پہچان کلچرل کانگریس کی ان ہفتہ وار ادبی نشستوں میں ہوئی تھی کہ جس میں اُس وقت کے ترقی پسند ادیب ایک دوسرے کی ادبی تخلیقات پر ترقی پسندانہ تنقید کیا کرتے تھے۔ یہ ۲۰، ۲۲ سال پرانی بات ہے۔ میں ان دنوں ایف۔ ایس۔ سی کا طالب علم تھا اور غالباً شنکر میٹرک میں پڑھتا تھا۔ اپنے لباس اور چہرے بشرے سے نہ وہ طالب علم دکھائی دیتا تھا اور نہ ادیب بلکہ پرانی موٹریں مرمت کرانے والے کسی کارخانے میں کام کرنے والا چھوکرا۔ اسے میں نے ہر بار ایک بہت ہی میلا کچیلا پھرن اور مفلر پہنے دیکھا اور بہت دنوں تک کسی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پھر ایک دن اس نے اپنی ایک کہانی سنائی اور یہ کہانی سن کر سبھی چونک گئے، کہانی بہت اونچے معیار کی نہیں تھی۔ لیکن اس کے ڈکشن میں ایک نئی تازگی اور دل کشی تھی۔ جس نے سبھی کو اپنی طرف متوجہ کیا، اس کے بعد شنکر

نے کئی کہانیاں سنائیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد کلچرل کانگریس کا شیرازہ بکھر گیا اور
اس کے ساتھ شنکر بھی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ اس کے چھ یا سات سال
بعد جب شنکر ڈاکٹر شنکر رینہ بن کر آگیا، تو اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا، میلے
کچیلے پھرن میں وہ نحیف لاغر چھوکرا اب ایک بانکا سجیلا جوان بن گیا تھا۔
قد، شخصیت، رنگت اور چال ڈھال کے اعتبار سے شنکر بہت خوبصورت تھا اور
اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی اور اپنے مستقبل پر ایک نئے اعتماد کی چمک
نمایاں تھی، اپنی مردانہ وجاہت کا وقار بڑھانے کے لئے اس نے اپنے
چہرے پر ایک فرنچ کٹ داڑھی بھی بڑھائی تھی جو بہت خوبصورت لگتی تھی،
شہر میں سال دو سال کام کرنے کے بعد شنکر کچھ عرصہ کے لئے پھر غائب
ہوا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ چندی گڈھ میں ایم ڈی کر رہا ہے،
اس کے بعد شنکر نے باقاعدہ پریکٹس شروع کردی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس
کے قدم کچھ اس طرح جم گئے کہ اس نے شہر کے سب سے مصروف بازار میں
اپنا مطب کھول کر صبح شام مریض دیکھنا شروع کئے اور وہ اتنا مشہور اور مقبول
ہوا کہ دُور دراز دیہات سے بھی لوگ اس نئے مسیحا کے فیض سے فیضیاب
ہونے کے لئے آنے لگے، اس دوران میں یہ شکایات بھی سننے میں آئیں کہ
شنکر نے زیادہ سے زیادہ پیسہ بنانے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے
کچھ غیر پیشہ ورانہ اور کسی حد تک غیر اخلاقی حرکات بھی شروع کردیں۔ بعض
لوگوں کا کہنا ہے کہ اس قسم کی افواہیں اس کے رقیبوں نے اس کی کامیابی سے
جل بھن کر اڑائیں لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ یہ سبھی شکایات بالکل بے بنیاد

نہیں تھیں۔ شنکر پر پیسہ کمانے کا بھوت سوار تھا اور وہ رات دن پیسے کے چکر میں رہتا تھا۔ حد یہ ہے کہ وہ مریض دیکھنے کے لئے اننت ناگ اور سوپور تک جانے لگا اور بعض اوقات رات کے ایک ایک دو بجے تک مریض دیکھتا رہتا۔ صادق صاحب تک یہ شکایت پہنچی، تو انہوں نے اسے اننت ناگ تبدیل کر دیا۔ اور اس تبدیلی سے اگر چہ اسے بڑا ذہنی صدمہ پہنچا۔ لیکن مالی اعتبار سے یہ مصیبت اس کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ اننت ناگ میں سال بھر کے قیام کے دوران شنکر نے بقول اس کے بوریاں بھر روپے کمائے، لیکن روپے کی اس بھوک کے ساتھ ساتھ اس کی علمی اور ادبی پیاس بھی اسے برابر بے چین رکھتی تھی۔ اس لئے وہ ہر قیمت پر سرینگر لوٹنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اننت ناگ کی فضا اس شوق کو پورا کرنے کے لئے سازگار نہیں تھی، پیسہ بنانے کی خواہش ہر ڈاکٹر کے دل میں ہوتی ہے اور خاص طور پر نئے نئے ڈاکٹروں میں (میرے ڈاکٹر دوست مجھے معاف کریں گے کہ ان میں سے اکثر نے اس لئے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا ہے کہ اس میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت بنانے تک کی گنجائش نظر آتی ہے) لیکن شنکر رینہ کے لئے بے تحاشہ پیسہ بنانا ایک نفسیاتی تقاضا بھی تھا اور ایک سماجی ضرورت بھی، اس نے اپنی پیدائش سے لے کر اپنی جوانی تک مجبوری مفلسی تنگدستی اور بھوک کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اسے اپنے بچپن میں ہی دولت کی طاقت اور پیسے کے معجزے کا احساس اور اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ ایک ازلی بھوکے کی طرح کم سے کم وقت میں اپنی ساری محرومیاں دور کرنا چاہتا تھا۔ دوسری

بات یہ تھی کہ مکان، موٹر اور سوٹ بوٹ کے بغیر اس کی ڈاکٹری بے کار تھی، اپنی پہلی خواہش پوری ہونے کے بعد اب اس کے سینے میں خواہشات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا، وہ ایک خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ وہ دھوم دھام کے ساتھ اپنی بہن کی شادی کر کے اپنی برادری اور سماج پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا ماضی جو کچھ بھی رہا ہو۔ اس کا حال اور اس کا مستقبل تابناک ہے، وہ اپنے غریب ماں باپ کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اب ان کی دنیا بدل گئی ہے۔ اس کی یہ سبھی خواہشیں پوری ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے کار بھی خریدی، ایک بہت بڑے مکان کی تعمیر بھی شروع کر دی، شہر کی اونچی سوسائٹی میں اِسے رسائی بھی حاصل ہوگئی، اب صرف شادی کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن اس معاملے میں ابھی کشمیری پنڈت سماج ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ خاندانی وجاہت اور نسبی شرافت کے سوال بار بار اُٹھائے جاتے تھے اور بہت سے اچھے گھرانوں نے اسے صرف اس لئے قبول نہیں کیا کہ اس کا باپ ایک معمولی ملازم تھا، کوئی سرمایہ دار جاگیر دار نہیں تھا۔ ہندو سماج کی اس ٹیڑھی منطق اور فرسودہ ذہنیت نے شنکر کا دل توڑ دیا۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور وہ مردانہ وار اپنے سماج کے اس ذلیل حربے کا بھی مقابلہ کرتا رہا۔ پھر ایک دن اس کی قسمت اور ہمت رنگ لائی۔ اور اسے چندرا کے روپ میں ایک چاند سی بیوی مل گئی۔ جو شرافت، سادگی اور حسن میں ان تمام لڑکیوں سے کہیں بڑھ کر تھی کہ جنہوں نے شنکر کو صرف اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ اس کے پاس خاندانی وجاہت اور

وقار کا پاسپورٹ نہیں تھا۔ ہندو سماج کو اپنی تقدیر کے بل بوتے پر شکست دے کر شنکر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اور اپنی فتح و نصرت کے اسی نشے میں سرشار وہ لندن روانہ ہو گیا۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ اب دُنیا کی کوئی مشکل اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک نہیں سکتی۔ لندن جانے کے صرف تین چار ماہ کے اندر اندر اس نے چندرا کو بھی وہیں بُلا لیا۔ اور وہ اپنی زندگی سے مطمئن ایک نئی دنیا کی دریافت میں مصروف ہو گیا۔ کشمیر میں اپنی غیر متوقع اور غیر معمولی کامیابی پر مغرور ہو کر اسے یہ زعم ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکٹری کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے لیکن ہمیر سمتھ ہوسپٹل میں صرف چند ماہ کام کرنے کے بعد اس نے میرے نام ایک خط میں لکھا:۔

''مجھے معاف کیجئے، کہ کشمیر میں رہ کر مجھے یہ خبط ہو گیا تھا کہ میں میڈیکل سائنس کے متعلق وہ سب کچھ جانتا ہوں کہ جو مجھے جاننے کی ضرورت تھی، لیکن یہاں آنے کے چند دنوں کے اندر ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا، آپ یقین نہیں کر سکتے، کہ مجھ میں کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے، اور میں اپنے آپ کو کتنا حقیر سمجھنے لگا ہوں مرض کی تشخیص مریض، علاج اور اس کے ساتھ ڈاکٹروں کے رویے سے متعلق ہمارے وہاں کے طریق کار اور یہاں کے طریق کار میں کتنا فرق ہے۔ میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ جب میں یہاں سے لوٹوں گا۔ تو میں اپنے لوگوں کے لئے یقیناً زیادہ مفید اور کار آمد ثابت ہوں گا۔ میں اس بات کے لئے عمر بھر آپ کا مشکور رہوں گا۔ کہ آپ نے مجھے یہاں آنے کی نہ صرف

تحریک اور ترغیب دی بلکہ مجھے مجبور کیا۔''

ڈاکٹر شنکر رینہ کے اس احساس نے میرے لئے اس کی موت کے سانحے کو کچھ زیادہ الم ناک اور روح فرسا بنا دیا ہے۔ اب جبکہ وہ اپنی تمام خامیوں، محرومیوں اور ناتجربہ کاریوں سے پاک ہوکر اپنے ماں باپ بھائی، بہنوں اور اپنے سماج کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا تھا، وہ ہم سے اس طرح چھن گیا کہ اب وہ نہیں صرف اس کی یاد ہی آسکتی ہے...... شنکر کوئی فرشتہ صفت انسان نہیں تھا اور نہ ساری انسانی خوبیوں کا مجموعہ، اس میں بہت سی خامیاں بھی تھیں اور جس ماحول میں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس نے اس میں بہت سی بُرائیاں بھی پیدا کردی تھیں۔ اپنی محرومیوں کے احساس اور زمانے کی سردمہری سے انتقام لینے کے جذبے نے اسے کسی حد تک وحشی بنا دیا تھا۔ مجھے بارہا ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے ماں باپ کی اس خطا کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ کہ وہ اتنے غریب، گمنام اور بے آسرا کیوں تھے۔ اس لئے اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور دوسرے رشتے داروں کے تئیں اس کے جذبات میں وہ حدت اور شدت نہیں تھی کہ جو عام طور پر ایک بیٹے کے دل میں اپنے ماں باپ کے لئے ہوتی ہے۔ بے رحم سماج کے مہلک تضادات نے خود اس کی شخصیت اور نفسیات میں بھی وہی اُلجھاؤ اور انتشار پیدا کیا تھا کہ جس نے اس کی فطرت اور مزاج کو اپنے اردگرد کی دنیا سے بیزار کردیا تھا۔ شنکر میرا بہت قریبی اور گہرا دوست تھا۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے بڑی تکلیف ہورہی ہے کہ اپنے غریب رشتہ داروں کے تئیں اس

رویہ بھی بہت ہمدردانہ نہ تھا۔ اس کی محبت، اس کی توجہ اور اس کی شفقت کے زیادہ تر اُمیدوار امیر اور آسودہٗ حال لوگ ہی ہوا کرتے تھے اور غریب اور مفلوک الحال بیماروں کے تئیں اس کے انداز میں ایک شعوری استغنا کا احساس نمایاں تھا۔ وہ بہت سے غریبوں کی مدد کیا کرتا تھا۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ یہ اس کے بچپن کا قرض ہے کہ جس کا چکایا جانا ضروری تھا۔ بہر حال اس قسم کے تضادات اور ذہنی اُلجھاؤ کس کے ہاں نہیں ہوتے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی نفسیاتی مرض یا کیفیت کا شکار ہے اور شنکر اس سے کیوں بچ سکتا۔ شنکر بحیثیت ڈاکٹر کیا تھا اس کے متعلق دو رائیں ہیں۔ کچھ لوگ (اور ان کی تعداد خاصی ہے اسے مسیحا کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ بہت سے مریضوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ہمیں دوسرے ڈاکٹروں نے مایوس کر دیا تھا۔ لیکن شنکر نے ہمیں زندگی عطا کی۔ ایسے بھی لوگ ہیں کہ جو اسے ڈاکٹر نہیں بازاری حکیم کہتے تھے اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتے تھے۔ کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس نے اچھے بھلے لوگوں کو بیمار بنا دیا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹروں کی قابلیت اور نا قابلیت کے متعلق یہ بحث ہمیشہ چلتی رہے گی۔ اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اتنی مختصر مدت اور اس کم عمری میں ڈاکٹر شنکر رینہ نے بحیثیت ڈاکٹر جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کرامت بغیر پیر کے ممکن نہیں۔ شنکر کی پیشہ ورانہ صلاحیت کچھ بھی رہی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیری زبان

کے افسانے اور ڈرامے میں اس کا مقام محفوظ ہے ۔ اس کی کہانیوں کے موضوعات اور اس کے ڈراموں کے عنوانات میں موت کا گہرا سایہ نمایاں طور نظر آتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لاشعور میں زندگی اور موت کے کردار اکثر ایسی بحثوں میں اُلجھے رہتے تھے...... یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس شہر میں شنکر رینہ سے بہتر ڈاکٹر پیدا ہوتے رہیں گے ۔ لیکن اس کی صلاحیتوں والا کوئی افسانہ نگار یا ڈرامانویس کشمیری زبان میں پیدا ہوگا یا نہیں ۔ اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ۔

شنکر کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے لگ بھگ اپنی سبھی خواہشات پوری کرلیں ۔ لیکن اب جبکہ اس کے غریب والدین کی خواہشات پوری ہونے کا وقت آیا تھا ۔ موت نے مداخلت کر کے ایک خطرناک المیے کو جنم دیا ہے ۔ شنکر کی ایک آخری خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اس بیٹی کو ایک بار دیکھ لے ۔ کہ جو اس کے لندن جانے کے چند ماہ بعد پیدا ہوگئی تھی ۔ اس کی صرف یہی ایک خواہش پوری نہیں ہوئی ۔ لیکن ان ماں باپ کی بدقسمتی پر رونا آتا ہے کہ جن کا زندہ وجود حسرتوں اور آرزوں کا مدفن ہے ۔ قدرت کتنی بے رحم اور بے درد ہوسکتی ہے یہ دیکھنا ہو تو شنکر رینہ کے بوڑھے ماں اور باپ کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھئے کہ ان میں سیاہی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ۔

☆

۲۰ مارچ ۱۹۷۷ء

کرشن چندر...... کچھ یادیں (۱)

بمبئی میں اپنے قیام کے دوسرے دن میں نے کرشن چندر کے ہاں فون کیا، تو ان کی بہو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ کرشن جی پر پھر دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اور وہ پرسوں سے بمبئی ہسپتال میں ہیں۔ ابھی تک مسلسل آٹھ حملے ہو چکے ہیں۔ بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ آخری فقرہ کہتے ہوئے بہو ہچکیاں بھرنے لگی۔ اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ اس لئے میں نے دوسرے دن علی الصبح ہسپتال جا کر کرشن جی کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن دوسرے دن علی الصبح سریندر سنگھ نے فون پر اطلاع دی کہ ہسپتال جانا بے کار ہے۔ آج صبح چھ بجے ان کا دیہانت ہو گیا ہے۔ اور ان کی لاش ان کے گھر پہنچائی جا رہی ہے۔ وہیں پہنچ جایئے کرشن چندر کی موت کا حادثہ میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا ایک سال قبل، ان پر دل کی بیماری کا

شدید حملہ ہوا تھا۔ اور وہ مرتے مرتے بچ گئے تھے۔ بلکہ بقول سلمیٰ صدیقی (مسز کرشن چندر) وہ کچھ لمحوں کے لئے مر بھی گئے تھے لیکن بمبئی ہسپتال کے ڈاکٹروں نے پیس میکر لگا کر انہیں نئی زندگی عطا کی تھی۔ اُس بار جب میں انہیں دیکھنے کے لئے ہسپتال گیا تھا۔ تو انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب وہ شراب کو ہاتھ بھی نہ لگائیں گے۔ انہوں نے اپنی بیوی سلمیٰ سے مخاطب ہو کر کہا تھا، ''سلمیٰ تم کہتی تھیں نا کہ کسی معتبر گواہ کے سامنے وعدہ کرلو۔ لو آج میں شمیم کے سامنے وعدہ کرتا ہوں۔ کہ پھر کبھی اس ظالم چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں گا'' ...... کرشن چندر اپنے اس وعدے پر قائم رہے یا نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن موت اپنے وعدے پر قائم رہی۔ اور اس نے ایک سال قبل جس محاذ پر شکست کھائی تھی۔ ۸ مارچ کی صبح کو اس پر فتح حاصل کر کے کرشن جی کو ہم سے چھین لے گئی۔

کرشن چندر اپنے عہد کے اتنے بڑے فنکار اور عظیم افسانہ نگار تھے، کہ ان کے فن اور ان کے ادبی مرتبے اور ان کے تخلیقی کارناموں کا جائزہ لینے والے کا خود بہت بڑا فن کار ہونا ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ ملک کے بہت بڑے سے صاحب نظر نقاد اور صائب الرائے ادیب یہ فرض بخوبی انجام دیں گے۔ لیکن کرشن جی کے ادبی کارناموں ان کی افسانہ نگاری اور انشا پردازی کے پیچھے جو رنگا رنگ شخصیت چھپی ہوئی تھی اس سے صرف وہی لوگ آشنا ہیں کہ جنہیں کرشن چندر کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اور میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں۔ کہ جنہیں کرشن

چندر کی رفاقت ہی نہیں، ان کی بے پناہ محبت بھی حاصل رہی ہے ان کے افسانوں اور ان کے طنزیہ مضامین کی معرفت یوں تو میری ان سے شناسائی بہت پرانی ہے لیکن پچھلے سات برسوں سے ان کے اور میرے درمیان دوستی اور مفاہمت کا وہ رشتہ قائم تھا کہ جسے عقیدت نہیں محبت کہتے ہیں۔ ان سے پہلی باضابطہ ملاقات کا حادثہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ یہ غالباً ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے کہ بمبئی میں ایک کل ہند اُردو کنونشن کا انعقاد ہوا تھا۔ کرشن چندر اس کے روح رواں تھے۔ اس کنونشن میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی شریک ہوئی تھیں۔ اور کرشن چندر نے اپنے مخصوص انداز میں وزیر اعظم کی عدالت میں اُردو کا مقدمہ پیش کیا تھا۔ میں بھی نہ معلوم کس حیثیت سے اس کنونشن میں شریک تھا اور شام کو صابو صدیق کے وسیع احاطے میں کنونشن کے ایک کھلے اجلاس میں مجھے بھی تقریر کرنے کا موقع ملا...... آج آٹھ برس بعد مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی تقریر میں کیا کہا صرف یہ یاد ہے کہ میری تقریر پر دس بارہ ہزار کا مجمع تو تالیاں پیٹ رہا تھا۔ لیکن سٹیج پر بیٹھی ہوئی سرکردہ ادبی شخصیات کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں یہ غالباً نیم سرکاری قسم کا کنونشن تھا۔ اور میں سرکار ہی کو اُردو کے ساتھ ناانصافی کا مجرم قرار دے کر غلط موقع پر صحیح بات کرنے کی اپنی روایت کا پالن کر رہا تھا۔ کرشن چندر نے...... نے "آئینہ" کے سالنامہ (۱۹۷۰ء) میں اس حادثے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"شمیم کی تحریر دیکھنے سے پہلے میں ان کی تقریر سن چکا تھا۔ اور بڑے نازک وقت میں یہ تقریر سن چکا تھا۔ بمبئی میں اُردو کنونشن کے موقعے پر ہوم

منسٹر شری چوان کی موجودگی میں جناب شمیم نے جودھواں دھار تقریر فی البدیہہ فرمائی تھی اور جس صاف گوئی سے اُردو کے سلسلے میں ہونے والی سیاسی دھاندلیوں کا پردہ چاک کیا تھا اور جس تقریر کی چنگاری صرف حکومت ہند ہی پر نہیں۔ اس خاکسار پر بھی بکھر رہی تھیں۔ یہی وہ شعلہ بیانی تھی یا تقریر کا جادو تھا کہ کوئی گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا'' یہ کرشن چندر سے میری پہلی ملاقات اور میرا پہلا تصادم تھا۔ اور اس کے بعد ہم ایک دوسرے پر کچھ اس طرح عاشق ہو گئے، کہ ہمارے درمیان مغائرت اور اجنبیت کے سبھی فاصلے مٹ گئے۔ میں جب بھی بمبئی جاتا، کرشن جی سے ملاقات کے لئے ایک شام ہمیشہ مخصوص رہتی۔ اس شام وہ صرف مجھے ہی نہیں، بہت سے دوستوں کو مدعو کر کے اپنے گھر پر ایک باقاعدہ 'محفل' کا اہتمام کرتے، پہلے شعر و شاعری ہوتی، ادبی مناظرے اور مباحثے ہوتے۔ اور آخر میں کرشن چندر کی ایک تقریر ہوتی۔ تقریر کرتے وقت وہ اکثر کیف و سرور کے عالم میں ہوتے۔ اور تقریر کا ہمیشہ ایک ہی موضوع ہوا کرتا تھا۔ کشمیر اور اس کی بے پناہ خوبصورتی! انہیں کشمیر سے بے حد لگاؤ تھا۔ اور اس کے ذکر سے ہی ان پر وجد اور جنوں کی سی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے ان کا لگاؤ بھی اس محبت کی توسیع تھی۔ اور اس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کیا کرتے ''شمیم آ جاتے ہیں تو میں اپنے ہی گھر میں کشمیر کی جنت آباد کرتا ہوں۔ کیوں کہ ہر کشمیری کے بدن سے کشمیر کی مٹی اور اس کی ہواؤں کی خوشبو آتی ہے''۔

پچھلے سال جب وہ قلب کی بیماری کے ایک خطرناک حملے میں مبتلا

ممبئی ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ تو میں انہیں دیکھنے کے لئے خاص طور پر بمبئی گیا۔ سخت نقاہت اور کمزوری کے عالم میں بھی انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا کہ "بس! اب میں ٹھیک ہو گیا۔ مجھے کشمیر کی تازہ ہوا مل گئی ہے۔ اور میری بیماری کا صرف یہی ایک علاج ہے...... ڈاکٹروں نے انہیں زیادہ بات کرنے کے لئے منع کیا تھا...... لیکن کرشن جی پر تو کشمیر کا جادو سوار تھا۔ وہ ڈاکٹروں کی بات کہاں مانتے۔ بالآخر مجھے ہی وہاں سے قبل از وقت رخصت ہونا پڑا۔

۸ مارچ کی منحوس صبح کو کرشن چندر کی موت کی خبر سن کر جب میں شانتا کروز میں ان کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کرشن جی کی لاش ابھی ہسپتال سے نہیں آئی تھی اور اس کمرے میں بیٹھ کر دوست احباب کرشن جی کی لاش کا انتظار کر رہے تھے کہ جس میں انہوں نے نہ معلوم کتنی بار کرشن چندر کو موت پر طنز کرتے ہوئے زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے سنا تھا۔ سلمیٰ آپا ایک کونے میں غم و اندوہ کا ایک مجسمہ بنی بیٹھیں شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ زندگی کا یہ کٹھن سفر کرشن جی کے بغیر کیسے گزرے گا۔ وہ کرشن جی کی بیوی ہی نہیں۔ ان کی بہترین دوست بھی تھیں میں نے پچھلے آٹھ سال کے دوران ایک بار بھی کرشن جی کو سلمیٰ آپا کے بغیر اور سلمیٰ آپا کو کرشن جی کے بغیر نہیں دیکھا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اب کرشن جی سلمیٰ کے بغیر اور سلمیٰ ان کے بغیر کیسے رہ سکیں گی؟ جس کمرے میں بیٹھا میں کرشن جی کی لاش کا انتظار کر رہا تھا، اس کمرے کے ساتھ میری بہت سی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں بیٹھ کر

میں نے اس دور کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر سے صرف اس کے افسانے نہیں۔ اس کے دردِ دل کی حکایت بھی سنی ہے۔ اس سے مناظرے ...... اور مباحثے کئے ہیں، اسے بچوں کی طرح مچلتے اور بگڑتے دیکھا ہے۔ اُسے ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ہر شام شراب پی کر اپنے سارے دُکھ درد بھولتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ غالباً ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ میں جناب شیخ صاحب کے ساتھ بمبئی میں تھا۔ کرشن جی صادق صاحب مرحوم کے ذاتی دوست ہونے کے باوجود شیخ صاحب سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ وہ شیخ صاحب کو ایک شام اپنے ہاں مدعو کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا شیخ صاحب ضرور آئیں گے۔ لیکن ان کی موجودگی میں ناؤ نوش کا دور نہ چلے کرشن جی نے کہا کہ ناؤ نوش کا دور چلے گا ضرور لیکن ان کی آمد سے پہلے وہ ختم ہو چکا ہوگا۔ آپ ذرا شیخ صاحب کو لے کر کچھ دیر سے آجائیے۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے میں اور شیخ صاحب پہنچے تو کرشن کے ہاں مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، سردار جعفری، ظ انصاری اور بہت سے لوگ موجود تھے۔ شیخ صاحب کے داخل ہوتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا۔ سب لوگ سنبھل گئے۔ لیکن خود کرشن چندر عالم کیف وسرور میں تھے۔ انہوں نے حسب معمول ایک خیر مقدمی تقریر ارشاد فرمائی۔ جس میں انہوں نے پہلے کشمیر سے اور پھر شیر کشمیر سے اپنی عقیدت کا احوال بیان کیا۔ اس کے بعد محفل شعر و سخن آراستہ ہوئی۔ اور بہت دیر تک مجروح، سردار اور جان نثار اختر اپنا بہترین کلام سناتے رہے اب کی بار کرشن جی نے ایک عدد فوٹو گرافر کا بھی انتظام کیا تھا اور حاضرین

محض شیخ صاحب کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں کھچواتے رہے...... مجھے یاد نہیں کہ محفل کے کس دور میں، شیخ صاحب نے کرشن چندر اور سلمیٰ کو کشمیر آ کر ان کا مہمان بننے کی دعوت دی۔ لیکن مجھے یاد ہے۔ کہ دوسرے دن کرشن جی نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ شیخ صاحب نے مجھے اور سلمیٰ کو کشمیر آنے کی دعوت دی ہے اور ہم اس سال گرمیوں میں ضرور کشمیر آئیں گے۔ اس سال کرشن چندر اپنی بہن کے ایک حادثے میں فوت ہو جانے کی وجہ سے کشمیر نہیں آسکے۔ لیکن دوسرے سال جب انہوں نے شیخ صاحب کو ایک خط لکھ کر کشمیر آنے کی اپنی خواہش کا ذکر کیا تو شیخ صاحب نے انہیں وہ جواب دیا کہ کرشن چندر کا دل ٹوٹ گیا۔ اور وہ کشمیر آنے کی حسرت لے کر ہی اس دنیا سے چل دیئے۔

یادوں کا قافلہ دل کے دروازے پر دستک دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور میں اس سوچ میں غرق تھا، کہ کرشن چندر کی موت سے پیدا ہونے والا خلاء کیسے پُر ہوگا۔ ایک وہ خلاء ہے کہ جو سلمیٰ آپا کی زندگی میں پیدا ہوا ہے دوسرا وہ جو دوست احباب کی زندگی میں، اور تیسرا اُردو افسانے اور ناول کی دنیا میں...... کرشن چندر کی موت ایک اسلوب ہی نہیں۔ ایک عہد کی موت ہے یہ ایک افسانہ نگار کی ہی نہیں۔ ایک تہذیب کی موت ہے۔ وہ جتنے بڑے افسانہ نگار تھے۔ اس سے کہیں زیادہ بڑے آدمی تھے اور اس راز کو صرف وہ جانتے تھے جو کرشن چندر کے اندر کے کہانی کار سے بھی واقف تھے اس کہانی کار سے بھی واقف تھے۔ کہ جس کا تخیل اپنی بلندیوں کے باوجود

زمین کی پستیوں سے اپنی خوراک حاصل کیا کرتا تھا۔

۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء

کرشن چندر...... کچھ یادیں (۲)

کرشن چندر کی تین کمزوریاں تھیں، اُردو، سوشلزم اور کشمیر، اُردو کے معاملے میں وہ اتنے کٹر تھے۔ کہ اس مسئلے پر وہ کوئی سمجھوتہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ میں نے انہیں عام طور پر کسی نزاعی بحث میں اُلجھتے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن دو سال قبل وہ اپنے ایک بہت ہی قریبی دوست راہی معصوم رضا سے اس موضوع پر اس بری طرح اُلجھ گئے کہ مجھے ان کا غصہ دیکھ کر وحشت ہونے لگی...... راہی نے کسی ادبی محفل یا مذاکرے میں اُردو کے متعلق شاید یہ کہا تھا کہ اُردو اور ہندی میں رسم الخط کے علاوہ کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ کرشن چندر لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ اور انہوں نے بمبئی کے روزنامہ ''انقلاب'' میں راہی کو وہ صلواتیں سنائیں کہ جیسے راہی معصوم رضا ان کا سب سے بڑا دشمن ہو۔ حالانکہ راہی ان کے بہترین دوستوں میں

تھے۔ میں نے ایک دن کہا کہ کرشن چندر جی! راہیؔ نے جو کچھ کہا ہے اس پر اتنا شدید ردعمل ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے مجھے تو ان کی بات میں خاصا وزن نظر آتا ہے میرا یہ کہنا تھا کہ وہ مجھ پر بھی برس پڑے کہنے لگے "تم نہیں جانتے، یہ ہندی والوں کی سازش ہے۔ اور وہ اس دلیل سے اُردو کے وجود کو ختم کرنا چاہتے ہیں...... میں اپنی جان دوں گا۔ لیکن اس سازش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اور اگر تم بھی راہیؔ کے ساتھ اس معاملے میں متفق ہو...... تو پھر تمہاری اور میری دوستی ختم" ...... کرشن جی کا یہ فیصلہ سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی...... اور میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ میں نے راہیؔ کی بات میں وزن کا ذکر کیا ہے۔ اُس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ اس پر بہت خوش ہو کر کہنے لگے۔ تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کیا، ورنہ میں یہی سمجھتا کہ راہیؔ نے ایک اور سمجھ دار آدمی کو گمراہ کر دیا۔ کرشن چندر اُردو کے رسم الخط کے بارے میں بھی کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور وہ بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کرتے تھے۔ کہ اُردو کا موجودہ رسم الخط بہر حال قائم رہنا چاہیے۔

میں کہہ نہیں سکتا، کہ کرشن چندر کا مارکسزم کا مطالعہ کتنا گہرا تھا۔ اور وہ اپنی عملی زندگی میں کس حد تک سوشلزم پر عمل پیرا تھے...... لیکن ان کی کہانیوں اور ان کی دوسری تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں سوشلزم کا ایک رومانی تصور تھا۔ انہیں سماج کی طبقاتی کشمکش کا احساس تو تھا۔ لیکن میرے خیال میں اس سلسلے میں ان کا نکتہ نظر سائنٹفک نہیں ادبی تھا...... انہیں

سوشلزم سے بھی اس طرح کا لگاؤ تھا...... کہ جس طرح اُردو اور کشمیر سے انہیں والہانہ محبت تھی ...... ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بناء پر انہیں کمیونزم اور سودیت روس کی ہر بات اچھی لگتی تھی ۔ اور وہ ایک انتہائی حساس فن کار ہونے کے باوجود اس قید اور اثر سے آزاد نہیں ہو سکے ۔ تین سال قبل کشمیر میں اپنے قیام کے دوران ایک بار مجھ سے کہنے لگے...... کہ جو شخص سوشلزم پر یقین نہیں رکھتا...... وہ نہ اچھا ادیب ہو سکتا ہے...... اور نہ اچھا انسان، تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ اگر آپ روسی سوشلزم کی بات کرتے ہیں تو مجھے آپ سے اتفاق نہیں لیکن اگر سوشلزم سے آپ کی مراد سماجی انصاف اور برابری ہے۔ تو میں بہت حد تک آپ سے متفق ہوں گا...... میرے اس جواب سے وہ مطمئن نہیں ہوئے...... اور کہنے لگے کہ ایسا لگتا ہے کہ تم امریکی صحافت اور لٹریچر سے اس درجہ متاثر ہو گئے ہو کہ سوویت روس کے متعلق تم ذہنی تعصب کا شکار ہو گئے ہو اور اسکے بعد انہوں نے روسی انقلاب کی عظمت اور تاریخی اہمیت پر مجھے اپنی بصیرت میں شامل کرنے کی کوشش کی...... کرشن چندر نظریاتی اعتبار سے سوشلسٹ بلکہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود اپنی ذاتی زندگی میں بڑے زندہ دل اور مرنجاں آدمی تھے...... انہیں کھانے پینے ہی کا نہیں ۔ کھلانے پلانے کا بھی بڑا شوق تھا اور وہ ہر روز کسی نہ کسی مرغے (مہمان) کی تلاش میں رہتے تھے۔ تاکہ شام کو اسے گھر بلا کر اس کی خاطر تواضع کریں...... اور اس معاملے میں اہلیان کشمیر کو ہمیشہ ترجیح حاصل رہتی تھی...... کشمیر ان کی تیسری مگر سب سے بڑی کمزوری تھی ۔ کہتے تھے کہ میں

نے دنیا دیکھی ہے۔ لیکن جو حُسن اور تنوع کشمیر میں ہے، دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ انہیں کشمیر کے پہاڑوں اور سبزہ زاروں، یہاں کی جھیلوں اور جھرنوں سے ہی نہیں، یہاں کے رہنے والے انسانوں سے بھی بڑی محبت تھی۔ ان کی اکثر کہانیوں اور ان کے کئی ناولوں میں کشمیر کے فطری مناظر کے پسِ منظر میں کشمیر کے غریب عوام کی جدوجہد کا ذکر موجود ہے کشمیر کے غریب اور مفلوک الحال انسانوں سے ان کی یہ وابستگی ایک رحم دل سیاح یا کہانی کار کا احساس ترحم نہیں۔ بلکہ ان کے دل کی دھڑکنوں کو اپنے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ کرنے کا وسیلہ ہے۔ کرشن چندر کہتے تھے کہ میں جب ایک بار کشمیر جاتا ہوں تو مجھے دو تین سال زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اور جس طرح بجلی کے ذریعے گاڑی کی بیٹری چارج کی جاتی ہے۔ اسی طرح میں کشمیر جا کر اپنی زندگی کی بیٹری چارج کرتا ہوں۔ خوش قسمتی سے کشمیر میں کرشن چندر کے بہت سے مداح موجود تھے...... جو ان کے ناز اور نخرے اُٹھانے کو اپنی بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے...... ان مداحوں میں خواجہ غلام محمد صادق...... شری ڈی - پی - در، پیر غیاث الدین کے نام قابل ذکر ہیں...... جب صادق صاحب وزیر اعلیٰ تھے تو انہوں نے کرشن چندر کو یہاں مدعو کر کے اپنا ذاتی مہمان بنایا تھا۔ اور کرشن جی اپنی اس عزت افزائی پر بہت خوش تھے۔ کرشن چندر نے نہ معلوم کیوں شیخ صاحب سے بھی کچھ ایسی ہی توقعات وابستہ کی تھیں۔ لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ شیخ صاحب کو آج تک ان کی ایک کہانی پڑھنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اس لئے وہ کرشن چندر کی عظمت اور ان

کے ادبی مرتبے کا اندازہ نہیں کر سکتے یہی وجہ ہے کہ جب کرشن چندر نے شیخ صاحب کی دعوت پر کشمیر آنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو شیخ صاحب کے روکھے پھیکے جواب نے ان کا دل توڑ دیا...... اور انہوں نے میرے نام خط میں اس کی شکایت کر کے اپنی ناراضگی ظاہر کی۔

اپنی موت سے چند دن پہلے بھی کرشن جی کو یہ بات یاد تھی...... سلمیٰ آپا نے بتایا کہ مرنے سے کچھ دن پہلے جب وہ مجھ سے اس بات کا اقرار لے رہے تھے کہ میں ان کی خاک کا کچھ حصہ دریائے جہلم میں بہانے کے لئے کشمیر بھیج دوں تو انہوں نے طنزاً کہا کہ "بشرطیکہ شیخ صاحب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔"

پچھلے تین برسوں میں کرشن چندر کو پے در پے دو المناک سانحوں کا سامنا کرنا پڑا...... جس سے اُن کا حساس دل اس درجہ متاثر ہوا کہ غالب کے الفاظ میں...... جس دل پر ناز تھا۔ وہ دل نہیں رہا سب سے پہلے ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ دل کے عارضے سے انتقال کر گئے۔ اور ان کی بیوی بچوں کا بوجھ ان پر آن پڑا...... اس کے ایک سال ہی بعد اُن کی بہن سکوٹر کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئیں...... ان دونوں جانکاہ حادثوں نے کرشن جی کے چہرے پر کھلتی ہوئی سدا بہار مسکراہٹ کو بے جان سا کر دیا تھا...... اور وہ کچھ بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے...... لیکن اس کے باوجود دوسرے غم نصیبوں کا غم ہلکا کرنے کی ان کی پرانی عادت قائم رہی۔ اور جب بھی کسی ادیب یا فن کار پر کوئی آفت آ جاتی، وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتے۔

میرے نام ان کا آخری خط آج سے چار ماہ پہلے آیا تھا...... اور اس میں جان نثار اختر کی موت کا ذکر تھا...... کرشن جی نے یہ خط اپنی بیماری کے دوران لکھا تھا...... اور اس میں مجھ سے یہ درخواست کی تھی۔ کہ میں حکومت کشمیر سے جاں نثار اختر کی بیوہ کے لئے ایک ماہانہ رقم منظور کروانے کی کوششیں کروں۔ تاکہ اس غم نصیب خاتون کو سہارا مل سکے۔ اس سے پہلے بھی وہ بہت سے ادیبوں اور فن کاروں کے لئے اس قسم کا فنڈ جمع کر چکے تھے۔

''آئینہ اور مدیر'' آئینہ'' کے متعلق کرشن چندر کی رائے انہی کی زبان سے سنئے۔

''آئینہ'' میں کشمیر کی جن سیاسی شخصیتوں کے بارے میں پڑھتا رہتا ہوں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے انہیں بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں حالانکہ بیشتر ایسی ہستیاں ان میں شامل ہیں ...... جن سے ذاتی طور واقف نہیں ہوں۔ یہی اس شعلہ صفت انسان کا کارنامہ ہے۔ جسے شمیم احمد شمیم کہا جاتا ہے۔ نام سنئے تو لگتا ہے کہ جیسے کوئی نہایت نرم و نازک مہکتا ہوا انسان ہوگا...... ملاقات کیجئے تو جیسے دہکتا ہوا شعلہ، مدافعت کے سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کر بیٹھے کون جانے کس وقت گویائی کا کارتوس کس طرف چل جائے بُری عادت پڑتے دیر نہیں لگتی، مجھے بھی ''آئینہ'' پڑھنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اس اخبار کے بارے میں شاید کہا گیا ہے۔ ''چھٹتا نہیں ہے منہ سے کافر لگا ہوا''

ملک میں ایمر جنسی کے نفاذ کے بعد سے مجھے کرشن چندر کے رویے سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ ایمر جنسی کے نفاذ کے فوراً بعد مجھ سے ایک ملاقات میں انہوں نے مسز گاندھی کے قدم کو فسطائیت کا بدترین مظاہرہ قرار دیا تھا...... لیکن پھر اپنی کمیونسٹ نوازی اور سوشلسٹ رجحان کی بناء پر ان کے اندازِ فکر میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔ اور وہ مسز گاندھی اور ایمر جنسی کی وکالت کرنے لگے...... میں نے ایک خط میں ان کی اس روش پر اپنی ناپسندیدگی کا نہیں ناراضگی کا بھی اظہار کر دیا۔ لیکن یہ خط پوسٹ کرنے کے چند ہی دن بعد مجھے سردار جعفری نے بتایا کہ کرشن پر دل کی بیماری کا زبردست حملہ ہوا ہے۔ اور وہ ہسپتال میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں اس لئے مجھے اس خط کا جواب نہیں ملا۔ لیکن چند دن بعد جب میں انہیں دیکھنے کے لئے بمبئی گیا۔ تو مجھے ان کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں میری ناراضگی کا احساس تھا۔ اور بعد کے واقعات نے انہیں میرا ہم خیال بنا دیا تھا ......دھرم یگ کے ایڈیٹر بھارتی اور راہی معصوم رضا نے مجھے بتایا کہ کچھ عرصے سے وہ مسز گاندھی اور ان کی حکمران جماعت سے اس درجہ بدظن ہو گئے تھے کہ موت سے دو ایک دن پہلے ہم سے کہہ رہے تھے کہ اب کی بار انتخابات میں مخالف پارٹیوں کی جیت ہونا چاہئے۔ ورنہ مسز گاندھی اس ملک پر موروثی حکومت مسلط کر دیں گی...... مجھے ان کی ذات سے صرف یہی ایک شکایت تھی......اور خدا کا شکر ہے کہ مرنے سے پہلے انہوں نے میری یہ شکایت بھی دور کر دی۔ آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہو کہ عہد حاضر کے اس عظیم

ادیب اور فن کار کے جنازے میں بمبئی جیسے بڑے شہر میں ...... پچاس ساٹھ آدمیوں سے زیادہ لوگ شامل نہیں تھے۔ ان کے نام کو استعمال کرنے والے فلمی تاجروں میں سے کوئی بھی جنازے میں شریک نہیں تھا...... ادیبوں میں ان کے اپنے دوست سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، راہی معصوم رضا، ظ انصاری، راما نند ساگر، اختر الایمان اور حاکموں میں صرف ڈاکٹر ذکریا کرشن جی کے انتم سنسکار کے وقت موجود تھے...... اس موقع پر ڈاکٹر رفیق ذکریا اور کئی سرکردہ ادیبوں کے علاوہ میں نے اپنا ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ میں نے کہا کرشن چندر کی موت جمہوریہ اُردو کے صدر کی موت ہے۔ اور اس کے جنازے کی بے بسی زبان حال سے اس زبان کی بے کسی کا اضافہ بیان کر رہی ہے کہ جس کو اپنا جائز مقام دلانے کے لئے کرشن چندر زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ کرشن چندر کے جنازے میں ہزاروں لوگ شامل ہوں گے لیکن میری نگاہیں ان ہزاروں لوگوں کے انتظار میں تھک گئیں۔ خدا حافظ کرشن چندر!

☆

۱۰ ستمبر ۱۹۷۶ء

پریم ناتھ در...... میرا یار

چالیس سال قبل جب پریم ناتھ در کا ایک افسانہ ادبی دنیا میں شائع ہوا تو اُس دور کے سب سے بڑے گوہر شناس صلاح الدین احمد نے دعویٰ کیا تھا کہ اُردو افسانے کے آسمان پر ایک نیا سُورج طلوع ہوا ہے۔ پچھلے چالیس برسوں کے دوران یہ بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہا۔ اور اپنی ضیاپاشیوں سے اُردو افسانے کو مالا مال کرتا رہا، ۶ ستمبر کی منحوس شام کو یہ سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ لیکن پریم ناتھ در کا اسلوب اس کا لہجہ اس کی جان دار زبان اور اس کی ٹیکنیک اُردو افسانے کے ایک بیش قیمت سرمائے کے طور پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔ در صاحب نے کہانی لکھنے کا فن کہاں سے حاصل کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن ان کی زندگی بجائے خود ایک ایسی کہانی تھی کہ جس میں ایک اچھی کہانی کے تمام عناصر موجود تھے، یہ بہت کم

لوگوں کو معلوم ہو گا کہ پریم ناتھ بزاز تحریک حریت کے ابتدائی دور کے ساتھ گہرے طور وابستہ رہے ہیں۔ ان کا شمار اُن گنے چنے کشمیری پنڈتوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے مسلم کانفرنس کے نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی قومی تحریک سے اپنی دلچسپی اور وابستگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ در صاحب کو اس بات کا بڑا فخر تھا کہ نیشنل کانفرنس کا سُرخ ہل والا جھنڈا ان کی تخلیق تھا اور ان ہی کی تجویز پر اسے قومی جھنڈے کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ تحریک حریت کے ابتدائی دور سے وابستہ سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ در صاحب اُن دنوں آزادی کی جدوجہد میں بڑے سرگرم تھے خود شیخ صاحب کو ان کی خدمات کا اعتراف تھا اور وہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، فروری ۱۹۷۵ء میں وزیر اعلیٰ بننے کے بعد شیخ صاحب کا انہیں سال بھر کے لئے اپنا پریس ایڈوائزر مقرر کرنا انہی خدمات کا اعتراف اور اس محبت کا اظہار تھا۔ ۱۹۴۰ کے قریب عملی سیاست کو خیر باد کہنے کے بعد در صاحب کچھ عرصے تک انگریزی صحافت سے بھی وابستہ رہے اور انہوں نے "ہندوستان ٹائمز" اور "سٹیٹسمین" جیسے سرکردہ اخبارات میں کام کیا۔ بالآخر ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو ہمارے اکثر بہترین دماغوں اور باصلاحیت فن کاروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہیں زندہ رہنے کے لئے سرکاری ملازمت کا سہارا لینا پڑا۔ اور وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ چار برس قبل وہ ریڈیو کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے تھے پھر سال بھر کے لئے محکمہ فیلڈ پبلسٹی کے ایڈوائزر رہے، گذشتہ سال وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے پریس اینڈ

پبلسٹی ایڈوائزر تھے۔ اور اب کے سال زندگی سے ریٹائر ہو کر چلے گئے۔ یہ ہے پریم ناتھ در کی ادبی، سیاسی، صحافتی اور سرکاری زندگی کا گراف۔ جس سے کم وبیش ان کے سبھی دوست اور دشمن اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن در صاحب سے میری دوستی اور میری محبت کا ان کی ادبی شخصیت، ان کے سیاسی میلان، صحافتی رجحان اور ان کے سرکاری نصب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے بحیثیت افسانہ نگار وہ بہت پسند تھے۔ مجھے کشمیر کی سیاسی تحریک سے ان کی وابستگی کا بھی احساس تھا اور اس تعلق سے میرے دل میں ان کے لئے بڑی عزت بھی تھی۔ لیکن وہ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتے تو بھی میرے دل میں ان کے لئے محبت اور عزت، دوستی اور احترام کے جذبات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ میں پہلے ان سے بحیثیت ایک انسان اور ایک دوست کے متعارف ہوا اور ان کی دوسری صلاحیتوں کا علم اور احساس مجھے بعد میں ہوا۔

در صاحب سے میری پہلی ملاقات ۲۰ سال قبل دہلی میں ہوئی تھی جب وہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ غالباً ان دنوں وہ آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی برائے کشمیر تھے۔ یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے اور میں ان ہی دنوں محکمہ اطلاعات کے ماہنامے "تعمیر" کا ایڈیٹر مقرر ہوا تھا۔ در صاحب سے میرا تعارف میرے اُستاد میر نصر اللہ اور میرے دوست دینا ناتھ نادم نے کروایا تھا۔ اس کے بعد در صاحب سے میری دوستی اور میری محبت اس تیزی سے پروان چڑھی کہ سال بھر کے بعد نصر اللہ اور نادم، دونوں ہی ہماری دوستی پر رشک کرنے لگے۔ میں جب جب در صاحب سے ملا، میں نے محسوس کیا کہ اس شخص کے وجود میں

ایک آگ ہے۔ ایک تڑپ ہے اور ایک عجیب طرح کی بے چینی، وہ ایک عجیب قسم کے احساس گناہ میں مبتلا ہے۔ اور وہ اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ رفتہ رفتہ میں نے اس کی روح کی گہرائیوں اور اس کے وجود کے نہاں خانوں میں جھانک کر دیکھا تو مجھے اس کے اندرونی کرب کو سمجھنے اور اس کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کا تجزیہ کرنے کا موقع ملا۔

در صاحب بڑے سرگرم اور جوشیلے نوجوان تھے اور انہوں نے ۱۹۳۸ء میں اپنی سیاسی زندگی کا آغاز بڑے دھڑے سے کیا تھا۔ انہیں کشمیر سے بے پناہ محبت تھی۔ اور وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے لیکن دشتِ سیاست میں دو ڈھائی سال کی صحرانوردی کے بعد ان کے پاؤں میں نہیں ان کے پیٹ میں چھالے پڑ گئے اور انہیں روزگار کی تلاش میں اپنے خوابوں اور اپنی تمناؤں کو نیلام کر کے سیاست کو خیرباد کہنا پڑا، انہیں زندگی بھر اپنی اس حماقت کا احساس رہا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے سارے خواب اُدھورے رہ گئے۔ مجھ سے ملنے کے بعد انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں کہ جو وہ کرنا چاہتے تھے اور نہ کر سکے وہ کہتے کہ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن اور اپنی جوانی یاد آتی ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے کہ تم میرے اُدھورے خواب پورے کرو گے، میں نہیں جانتا کہ در صاحب کے اس حسنِ ظن کی کیا بنیاد تھی، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ ان کی مجھ سے والہانہ محبت اس احساس کی پیداوار تھی۔ انہیں میری صلاحیتوں اور میرے مستقبل پر بے پناہ اعتماد تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے سرکاری ملازمت چھوڑ کر

وکالت اور بغاوت کی ترغیب انہوں نے ہی دی تھی یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے ان دنوں علی جواد زیدی جو آج کل ایران میں آل انڈیا ریڈیو کے نمائندے ہیں، بھی میرے خاص دوست تھے، میں نے جب سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر زیدی صاحب کو اپنے وکالت پڑھنے کے ارادے سے آگاہ کیا، تو انہوں نے مجھے اس خطرناک ارادے سے باز رکھنے کیلئے وکیلوں کی بیکاری، بے عزتی اور بے حرمتی کا ایسا بھیانک نقشہ کھینچا کہ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو وصیت کرتا۔ کہ اس کی آل اولاد میں سے کوئی شخص وکیل بننے کی حماقت نہ کرے۔ پھر میں نے انہیں سیاست میں حصہ لینے کے اپنے عزم سے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے میرے عبرت ناک انجام کی ایک ایسی تصویر کھینچی کہ میں کانپ اُٹھا۔ ٹھیک اُن ہی دنوں پریم ناتھ در سے بھی ان مسائل پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے نہ صرف میرے عزائم اور ارادوں پر مجھے مبارک باد دی، بلکہ بڑے اعتماد کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ تمہاری اصلی جگہ وکالت اور سیاست ہے، تمہارا مستقبل شاندار ہے اور تم سرکاری ملازمت کے پنجرے میں رہ کر اپنی ذات کے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔ ایک نادان "بچے" کو "گمراہ" کرنے کی پاداش میں بخشی غلام محمد اور میر نصر اللہ دونوں ہی در صاحب سے بہت ناراض اور زیدی صاحب سے بہت خوش ہو گئے۔ لیکن در صاحب نے اس "جنگ" میں اقتدار کا ساتھ دینے کی بجائے میرا ساتھ دیا اور میں یہ بات زندگی بھر نہیں بھول سکتا کہ در صاحب نے میر نصر اللہ صاحب سے اپنی دوستی اور بخشی صاحب سے اپنے مراسم سب کچھ چھوڑ کر نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ

مجھے مالی امداد کی بھی پیشکش کی۔ ڈر صاحب میرے دوست ہی نہیں، میرے رہنما بھی تھے اور انہیں مجھ سے بھی زیادہ میرے مستقبل پر اعتماد تھا۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں مجھ سے دوستی کا حق نبھایا کہ جب مجھ سے دوستی باعث عزت نہ تھی، موجب پریشانی تھی اور میں ساری زندگی ان کا یہ احسان نہیں بھول سکتا۔

۱۹۶۷ء میں جب میں نے آزاد اُمیدوار کی حیثیت سے شوپیان کے حلقہ انتخاب سے اپنے کانگریسی حریف کو شکست دی تو ڈر صاحب نے میرے نام ایک محبت بھرے خط میں اپنی خوشی کا یوں اظہار کیا...... ''یہ تمہاری منزل کا پہلا قدم ہے، میرے بھائی اور مجھے یقین ہے کہ اب اس کے بعد تم کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھو گے۔ جو کچھ دنیا آج دیکھ رہی ہے وہ میں آج سے دس سال قبل دیکھ چکا تھا۔ میں نے تمہاری کامیابی کی خبر سب سے پہلے علی جواد زیدی کو سنائی۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی میں بہت سی ایسی خبریں سننے کے لئے بہت دنوں تک زندہ رہوں گا۔''

۱۹۷۱ء کے پارلیمانی انتخاب میں میری کامیابی پر میرے نام ایک خط میں ڈر صاحب نے لکھا:-

''دنیا حیران ہوگی، کہ یہ کیسے ہوا؟ لیکن میں حیران ہوتا اگر ایسا نہ ہوا ہوتا مجھے تمہاری تقدیر اور تمہارے مستقبل پر تم سے بھی زیادہ اعتماد ہے۔''

۱۱ستمبر ۱۹۷۶ء

پریم ناتھ در...... میرا یار (۲)

اُردو پریم ناتھ کی مادری زبان نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے افسانوں میں اتنی شگفتہ، سلیس اور بامحاورہ زبان استعمال کیا کرتے تھے کہ اردو میں عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ ایسی خوبصورت زبان رکھنے والا افسانہ نگار میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ میں نے ان کے دوسرے افسانوی مجموعے...... "نیلی آنکھیں" کی تقریباً "سبھی کہانیاں در صاحب کی زبانی سنی ہیں۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ کہانیاں سناتے وقت ان پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ ایک بہت اچھے اداکار بھی تھے اسلئے اپنے افسانوی...... کرداروں کی جذباتی کشمکش اور نفسیاتی گہرائیوں کا بیان کرتے ہوئے بڑی کامیابی کے ساتھ ان کا لب ولہجہ بھی اختیار کرتے در صاحب نے کئی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اور درجنوں مضامین بھی۔ لیکن ان کا اصلی میدان کہانی تھا...... انہیں انگریزی زبان پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل

تھی۔ اور ان کی انگریزی تحریر اور تقریر میں بھی وہی بانکپن ہوا کرتا تھا کہ جو ان کی اُردو تحریر کی نمایاں خصوصیت تھی۔

درؔ صاحب کی دو کمزوریاں تھیں۔ ایک کھانا اور دوسرے بچے، وہ صرف اچھا کھاتے ہی نہیں۔ اچھا پکاتے بھی تھے اور کھانا پکانے اور کھلانے کا شوق...... انہیں جنون کی حد تک تھا۔ انہیں کھانا پکا کر دوست احباب کو کھلانے کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کی تلاش رہتی تھی۔ اور پھر وہ اس ذوق وشوق سے پکانے اور کھلانے میں محو ہو جاتے کہ جیسے ان کی زندگی کا یہی ایک مقصد ہو...... جن لوگوں نے درؔ صاحب کے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا ایک بار بھی کھایا ہو۔ (اور ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں پر مشتمل ہے) وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ بے مثال کھانا پکاتے تھے خاص طور پر ان کا بنایا ہوا قبرگاہ کہ جس پر وہ اتنی ہی محنت کرتے تھے کہ جتنی ایک اچھی کہانی پر۔ درؔ صاحب نے اپنے سبھی بچوں کو کھانا پکانے کی تربیت دی ہے۔ لیکن وہ بات جوان کے ہاتھ میں تھی، سب کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے۔

درصاحب کی دوسری کمزوری ان کے بچے تھے۔ بچے کس کی کمزوری نہیں ہوتے۔ اور کون سے ماں باپ اپنے بچوں پر اپنی زندگی نچھاور نہیں کرتے لیکن درصاحب اپنے بچوں سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پیار کیا کرتے تھے اور اس غیر معمولی اور غیر ضروری پیار نے ان کی اپنی...... زندگی کو ایک مستقل عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ بچے بالغ ہو جائیں تو انہیں اپنا بُرا بھلا سوچنے کی آزادی دینا چاہیے لیکن درصاحب اپنے بچوں کی زندگی میں اتنے

Involved تھے۔ کہ وہ ان کے لئے ہر فیصلہ خود ہی کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اس محبت سے ان بچوں کا کچھ بھلا ہوا یہ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن خود درّ صاحب اس کی وجہ سے زندگی بھر ایک عذاب اور اضطراب میں مبتلا رہے۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر انسانی نفسیات کی گہرائیوں پر ان کی بھرپور نظر کا اندازہ ہوتا ہے لیکن تعجب ہے کہ درّ صاحب اپنے بچوں کی نفسیات کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ پاتے تھے۔ اور میرا خیال ہے اسی وجہ سے وہ ان کی زندگی میں غیر ضروری دلچسپی بھی لیتے رہے۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر باپ اپنے بچوں کے تئیں یہی رویہ اختیار کرتا ہو۔ اور عین ممکن ہے کہ وقت آنے پر میں بھی ایسا ہی کروں۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنا آسان ہے۔ اپنی کمزوریوں پر نظر رکھنا اتنا آسان نہیں۔

درّ صاحب کی عمر ساٹھ باسٹھ سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن چہرے بشرے سے وہ پنتالیس چھیالیس سال سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ وہ ایک عرصے سے ذیابطیس (Diabities) کے مرض میں مبتلا تھے اور اس کی وجہ سے خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن اس عمر اور اس کمزوری کے باوجود یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ جوانی میں بہت وجیہہ اور خوبصورت نوجوان رہے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں بڑی خوبصورت اور چمک دار تھیں۔ اور وہ اپنی جذباتی کیفیات کے اظہار میں ان موٹی موٹی آنکھوں سے خوب کام لیتے تھے درّ صاحب کی آواز بھی متاثر کن تھی۔ اور انہیں اس کا بخوبی احساس تھا۔ وہ اپنی بیٹی وینا کو ڈرامے میں اداکاری کی تربیت دیتے ہوئے اس آواز کو اس فن کارانہ انداز سے استعمال کرتے تھے کہ مجھے بارہا اس بات کا

احساس اور افسوس ہوا کہ در صاحب نے اپنی صلاحیتوں کو آل انڈیا ریڈیو کی دفتری گھس گھس میں ضائع کر کے اپنے ساتھ ہی نہیں، ہم سب کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ہماری زندگی کا المیہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگ ساری زندگی وہ کام کرنے پر مجبور ہیں جن کے کرنے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ انسان کا اصلی جوہر اور اس کی صلاحتیں فضول کے کام کرنے میں صرف ہوجاتی ہیں۔ در صاحب نے افسانے لکھ لکھ کر اپنی شخصیت کے ایک گوشے کو تو بے نقاب کر دیا لیکن آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت نے ان کی بھرپور اور پہلو دار شخصیت کو اُبھرنے نہیں دیا۔ وہ بہت بڑے فن کار تھے لیکن ریڈیو میں وہ صرف ایک افسر ہو کر رہ گئے تھے!

در صاحب بڑے مذہبی آدمی تھے۔ ان کے دل میں بھگوان کا خوف بھی تھا اور انسان کی محبت بھی۔ وہ پوجا پاٹھ بھی کرتے تھے اور پیروں فقیروں کو بھی مانتے تھے لیکن ان کی مذہبیت میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں تھا کہ جو عام طور پر کٹر ہندوؤں یا کٹر ملاؤں میں ہوتا ہے وہ ذہنی طور ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی سماجی اعتبار سے رسوم ورواج کے سخت پابند تھے اور فکر و عمل کا یہ تضاد صرف ان ہی کے ہاں نہیں ہم سب کے ہاں موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ کچھ اس کی توجیہہ کرتے ہیں اور کچھ اس کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔ پریم ناتھ در کو اس بات کا احساس اور اعتراف تھا کہ وہ حقائق اور افسانوں کی ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ جس سے آزاد ہونا ان کے بس کی بات نہیں۔ در صاحب کی سب سے

بڑی خصوصیت ان کی انسان دوستی، خدا پرستی اور غریب پروری تھی۔ وہ مر گئے لیکن ان کی خوبیاں، بہت دنوں تک، بہت سے لوگوں کو یاد رہیں گی۔ وہ پچیس بلکہ تیس سال تک آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے اور اس بات کا امکان ہے کہ اس مدت میں کچھ لوگوں کو ان سے شکایات بھی رہی ہوں۔ لیکن میں یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ در صاحب کی شکایت کرنے والوں کے مقابلہ میں ان کی انسان دوستی، شرافت، مروت اور ہمدردی کو یاد رکھنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوگی...... وہ ایک انسان تھے اور ان میں ایک اچھے انسان کی ساری خوبیاں اور خامیاں موجود تھیں۔

در صاحب سے میری آخری ملاقات ۴ ستمبر کو ہوئی۔ اس روز انہوں نے مجھ سے ملنے کے لئے خاص اصرار کیا۔ میرے کانوں میں ابھی تک ان کا یہ فقرہ گونج رہا ہے کہ ''آ جاؤ! زندگی کا کیا بھروسہ پھر ملاقات ہو نہ ہو۔'' اور اس روز بھی حسب معمول انہوں نے بڑا پُر تکلف کھانا بنایا تھا۔ گھنٹے دو گھنٹے تک وہ اپنے خاص انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اور جب میں چلنے لگا۔ تو انہوں نے یاد دلایا کہ چیف منسٹر کے سکریٹریٹ میں ان کے آخری ماہ کی تنخواہ رُکی پڑی ہوئی ہے اور وہ مجھے جلدی بھیج دینا۔ ۵ ستمبر کو میں سرینگر پہنچا اور ۶ تاریخ کو میں نے ان کی تنخواہ برآمد کر کے انہیں فون پر اطلاع دینا چاہی کہ کل ان کی تنخواہ تار منی آڈر سے بھیج رہا ہوں۔ فون پر ان کے بیٹے نے کہا کہ ڈیڈی کو بخار ہے۔ وہ لیٹے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا اچھا، ان سے کہہ دو کہ پیسے کل آ جائیں گے۔ ایک گھنٹے بعد در صاحب کی بیٹی نے بھرائی ہوئی آواز

میں اطلاع دی کہ درؔ صاحب سرگباش ہوگئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عبدالقادر دیوان کی موت کے بعد میری زندگی کا ایک اور ستون گر گیا۔

درؔ صاحب میرے سچے یار تھے۔ اور اس دور میں اب سچے یار ملتے کہاں ہیں؟

۴ مئی ۱۹۷۸ء

چھوٹی چھوٹی باتیں

یہ دودھ بھارتی ہے:-

یہ دودھ بھارتی ہے آکاش وانی کا پنچ رنگی پروگرام...... ریڈیو کی سوئی گھما کر یہ آواز آپ روز ہی سنتے ہونگے۔ اور اس کے ساتھ ہی کئی بار اناؤنسر صاحب کی یہ آواز بھی آپ کے کانوں تک پہنچتی ہوگی۔ ریڈیو آپ کے کاروبار کو بڑھاوا دینے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

اس سلسلے میں خود ملئے یا یہ ٹیلی فون نمبر گھمائیے...... جی ہاں یہ ریڈیو کشمیر کی تجارتی سروس ہے۔ کہ جہاں فلمی گانوں کے مختلف پروگراموں کے ساتھ ساتھ مختلف اشیاء کے اشتہار بھی نشر کئے جاتے ہیں۔ اس سروس کو شروع ہوئے اب تو ایک عمر بیت چکی ہے۔ اور پہلے پہل تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ سروس ریڈیو سیلون کی تجارتی سروس کو مات دے گی...... لیکن آہستہ آہستہ یہ خیال ایک خواب ہی ثابت ہوا...... وجہ؟ اس سروس سے نشر کئے

جانے والے اشتہاروں کا معیار...... دودھ بھارتی سروس کو پورے ملک میں Commercialise کیا گیا ہے۔ اور جہاں تک دیگر اسٹیشنوں کا تعلق ہے۔ وہاں سے ایسے خوبصورت اور متاثر کن اشتہار نشر کئے جاتے ہیں کہ انسان بار بار صرف انہیں سننے پر ترجیح دیتا ہے...... اور جہاں اپنے سرینگر کیندر کی بات چھڑتی ہے...... تو انسان اشتہار سن کر یا تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونسنے پر مجبور ہوتا ہے...... یا پھر آواز بہت مدھم کرتا ہے...... ریڈیو پر اشتہار نشر کروانے کا مطلب اور مقصد صرف اتنا ہوتا ہے...... زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کوئی خاص شئے استعمال کرنے کی طرف راغب کیا جائے۔ اور اس مقصد کے حصول کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ان اشتہاروں کا متن، ان میں استعمال کی جانے والی آوازیں متاثر کریں، انہیں سن کر انسان بور نہ ہو...... ان میں بناوٹ اور تصنع نام کو بھی نہ ہو...... لیکن اپنے کیندر میں سب کچھ چلتا ہے۔ ریڈیو کشمیر کی کمرشیل سروس سے نشر کئے جانے والے اشتہارات اس قدر پھیکے، بدمزہ اور بناوٹی ہوتے ہیں۔ کہ خدا کی پناہ...... مثلاً سکیب کی بیماری کی روک تھام کے لئے چند اشتہار بنائے گئے ہیں...... ایک اشتہار میں ایک بہت ہی بھونڈی مردانہ آواز بھگوان سے دُعا کرتی ہے کہ اُس نے محنت کر کے اپنا باغ تیار کیا ہے۔ اس لئے اُس کے سیبوں کوئی نقصان نہ ہو۔ جہاں تک اس دُعا کے اندر چھپے ہوئے مقصد کا تعلق ہے۔ اُس کی ضرورت اہمیت اور افادیت سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔ لیکن جہاں تک اس کی پیشکش کا تعلق ہے بڑے تو بڑے...... چھوٹے بچے بھی یوں پکار اُٹھتے ہیں...... پاپا

...... بور...... سکیب کی بیماری کو دور کرنے کے سلسلے میں ایک اور اشتہار میں ایک صاحب کسی محترمہ کو بہت ہی محبت بھرے انداز میں پکارتے ہیں کہ اِدھر سنئے ۔ فروٹ انڈسٹری ہماری سب سے اہم صنعت ہے۔ اس پر لاکھوں کا دارمدار ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ...... اب ہمارے منتظمین کیندر کو کون سمجھائے...... صاحب اس قسم کا سنجیدہ اور اہم اشتہار اس طرح نشر کرنا مناسب نہیں...... خدا کے لئے اشتہار بناتے وقت، نشر کرتے وقت اپنے سامعین کا خیال بھی تو رکھا کیجئے...... آپ تو اپنے کاندھے سے ذمہ داری کا بوجھ اُتار پھینکتے ہیں...... لیکن ایسا کرنے سے قبل یہ تو ذرا دیکھئے کہ کوئی زخمی تو نہ ہوگا۔ کسی کو چوٹ تو نہ آئے گی...... لیکن...... میں بھی کہاں کی لے بیٹھا ...... اُنہیں اس بات سے کیا غرض...... اُن کی تنخواہ چلنی چاہئے...... وہ کسی بھی صورت میں چلتی رہے گی۔ چاہے سامعین بور ہی کیوں نہ ہوں...... اس سروس سے نشر کرنے والے اشتہاروں کے بارے میں یوں تو کہنا بہت کچھ تھا...... لیکن یہ سوچ کر کہ اثر اُن کو ذرا نہیں ہوگا...... نہ تو میں اپنے قارئین کا اور نہ اپنا وقت ضائع کرنا چاہوں گا۔

کوئی بتلاؤ کہ............؟:-

یوم مئی کے سلسلے میں گذشتہ روز وادی بھر میں خصوصی تقاریب منعقد ہوئیں...... شہر میں کئی جلوس نکلے۔ کئی جلسے ہوئے...... سب سے بڑے جلسے سٹیٹ سنٹرل لیبر یونین (شیر کشمیر پارک) اور لو پیڈ ایمپلائز فیڈریشن (کالج آف ایجوکیشن) کے تھے...... اور زیادہ تر مزدوروں اور محنت کشوں

نے انہی جلسوں میں شرکت کی...... لیکن اور چھوٹی سی ''جلسی'' پرتاپ پارک میں بھی منعقد ہوئی جس کا کسی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا...... حالانکہ اس جلسی میں چند ملازم لیڈروں نے بڑے پتے کی باتیں کیں...... چند تلخ حقیقتوں کا انکشاف کیا (یہ الگ بات ہے کہ سب کچھ شیر کشمیر زندہ باد کے نعروں کی گونج میں ختم ہو گیا) اس جلسے کے مہمان خصوصی نیشنل کانفرنس کے سب سے بڑے مزدور رہنما شیخ رشید تھے۔ اپنی تقریروں میں بیشتر ملازم لیڈروں نے اس بات کا گلہ کیا کہ اگرچہ جناب شیخ صاحب نے اقتدار کی سند سنبھالنے کے فوراً بعد اعلان کیا تھا کہ وہ ریاست میں استحصال کی صورت حال کا خاتمہ کریں گے...... افسر شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، لوگوں کو راحت پہنچائیں گے...... راشی اور بدعنوان افسروں کا قافیہ تنگ کریں گے...... محاسبہ کریں گے...... یہ کریں گے وہ کریں گے......

مگر یہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ ہوا کچھ نہیں، کیا کچھ نہیں...... اور لگتا ہے کہ نہ کرنے کا ارادہ ہے۔ ان مقرروں نے کہا کہ جہاں تک ان بڑے افسروں کا تعلق ہے کہ جو ۵۳ء کے بعد سے غریب ملازموں کا خون چوستے آئے ہیں جنہوں نے اپنے عہدوں کا ناجائز استعمال کر کے لاکھوں کا خرد برد کیا...... عالیشان عمارتیں بنائیں لاکھوں کا بنک بیلنس جمع کیا وہ آج بھی نہ صرف اپنے کار نیک میں مصروف ہیں اور ان کے خلاف کچھ نہیں کیا گیا...... بلکہ کئی ایسے افسروں کو ترقی کے انعام سے بھی نوازا گیا...... ایک مقرر کی تقریر سن کر میں کافی حیران ہوا، بے چارے بھولے بھالے مقرر پر شاید

اپنے رہنماؤں کی حسین و دلکش تقریروں نے کافی اثر کیا تھا...... اور وہ ان رہنماؤں پر جان چھڑ کنے کو تیار تھا...... باتوں باتوں میں اُس نے جلسے کے مہمان خصوصی شیخ رشید سے ایک سوال پوچھا۔ شیخ صاحب کی لال چوک والی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اقتدار اُن کا مقصد نہیں...... بلکہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ...... اور اس کے نتیجے میں وہ ریاست کے پچھڑے ہوئے غریب عوام کہ جن کا گذشتہ دور میں استحصال کیا گیا ہے، کی حالت بہتر بنائیں گے...... انہیں راحت کی زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کریں گے...... اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے اس بھولے بھالے مقرر نے شیخ رشید سے (کہ جو اپنے آپ کو شیخ صاحب کہلوانا پسند کرتے ہیں) پوچھا صاحب مجھے ذرا بتائیے کہ اس ضمن میں کیا ہوا ہے۔ کیا کچھ کیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا خیال غلط فہمی پر مبنی ہے...... اگر ہاں تو اسے دور کیجئے...... ہوسکتا ہے کہ میں حقیقت بیان کر رہا ہوں...... اگر ہاں تو پھر اس کی وجوہات بیان کیجئے اور یہ غلط فہمی یا حقیقت یہ تھی کہ ''حکومت تو بدل گئی ہے...... بابائے قوم نے اقتدار تو سنبھال لیا ہے۔ لیکن حکومت کی پالیسیاں نہیں بدلی ہیں...... پالیسیاں اور پروگرام تو وہی ہیں کہ جو ۵۳ء کے بعد حکمرانوں کی تھیں'' شیخ رشید اِن باتوں کا کیا جواب دیتے...... ہاں انہوں نے شیخ صاحب کی طرح ۳۱ء کی داستان کے اقتباسات سنانا شروع کئے۔ شیخ صاحب کس طرح جیل گئے...... کیوں گئے...... کیا کیا صعوبتیں برداشت کیں...... اور ایسا عظیم رہنما کبھی قوم سے غداری کر سکتا ہے۔ وہ تو

وفادار ہے لوگوں کا...... وہ سب کرے گا...... مگر وقت چاہئے ...... لیکن اس کے ساتھ ہی شیخ رشید کو یہ خیال آیا کہ انہوں نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی ہے اس لئے فوراً مزدور اتحاد کا فلسفہ چھیڑ دیا...... اور لگے ملازموں اور محنت کشوں کو نصیحت کرنے کہ بابا لوگو جب تک تم متحد نہیں ہو جاؤ گے...... تمہارے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے...... پھر اپنا روئے سخن انہوں نے فوراً لوپیڈ ایمپلائز فیڈریشن کی جانب موڑ دیا...... کہ جن کا جلسہ پارک کے بالمقابل ایجوکیشن کالج میں شروع ہونے جا رہا تھا...... اور لگے مہمان خصوصی چیخنے چلانے، ہم اُن لوگوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو ہنگامہ آرائی کرتے ہوں...... تم سب لوگ سمپت پرکاش اور اُس کی ٹولی سے خبردار رہو...... اُن کا مقابلہ کرو...... یہ کرو...... وہ کرو...... اور دیٹ آزال......

اب بھلا شیخ رشید صاحب کو کوئی سمجھائے کہ صاحب اس بھولے بھالے مقرر نے آپ سے جس بات کی وضاحت طلب کی تھی۔ اُس کا کیا ہوا...... لیکن ایک بات ضرور ہے۔ اس مقرر کے سوال کی وضاحت تو نہیں ہوئی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ مزدوروں اور محنت کشوں میں سوچنے اور سمجھنے اور پھر اپنی سوچ کا اظہار کرنے کی قوت آ گئی ہے۔ اور وہ کسی بھی بات کو چاہے وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو...... علی الاعلان کہنے سے ہچکچاتے نہیں...... یہ سوچ کافی خوشگوار ہے اور ہمیں اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

ہمیں کچھ پتہ نہیں:۔

افغانستان کے حالیہ انقلاب کے بارے میں چند دلچسپ خبریں

موصول ہو رہی ہیں...... اور جس خبر کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں اُسے آپ کیا معنی پہنائیں گے۔ یہ آپ جانیں۔

بتایا جاتا ہے کہ افغانستان میں جس روز صدر داؤد کے خلاف مسلح بغاوت ہوئی تو کابل میں تمام غیر ملکی سفارت خانوں کے باہر پولیس اور فوج کی بھاری تعداد متعین کی گئی۔ گھمسان کا رن جاری تھا صدر داؤد کی حامی اور مخالف افواج میں...... گولیاں چل رہی تھیں۔ گولے برس رہے تھے۔ بم گرائے جا رہے تھے اور سفارتی نمائندے حیران و پریشان یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ابھی تو چند گھنٹے قبل صورت حال مکمل طور پُر سکون تھی۔ لوگ مزے سے گھوم رہے تھے۔ اچانک یہ بن بلائی آتشیں برسات کہاں سے آ گئی۔ رابطے کے تمام ذرائع منقطع ہو چکے تھے۔ اس لئے اندر بیٹھ کر باہر کا حال معلوم کرنا ناممکن تھا۔ اور باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ خیر کمال بہادری کا مظاہرہ کر کے اور اپنی جان پر کھیل کر ایک مغربی ملک کے سفارت خانے کے چند اہلکار سفارت خانے کی عمارت کے صحن میں آ نکلے۔ اور ڈرتے سہمتے صحن کی دیوار تک جا پہنچے کہ جہاں پر متعین افغان فوجی اپنی بندوقوں کا مُنہ کھولے ہوئے بلا امتیاز فائرنگ کر رہے تھے۔ جی کڑا کر کے ایک سفارتی نمائندہ ان فوجیوں سے پوچھ بیٹھا۔ برادر ہمیں بھی تو معلوم ہو یہ کیا ہوا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ فوجی بولا کہ جاؤ اندر جاؤ۔ ہم سے کیا پوچھ رہے ہو۔ بخدا ہمیں بھی کچھ علم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں صرف گولی چلانے کا حکم ہے۔ سو ہم تعمیل کر رہے ہیں کس نے دیا کس کے خلاف دیا۔ ہمیں پتہ نہیں۔ کیوں ہے

نا بڑی مزے دار خبر۔

اکتوبر ۱۹۲۴ء

پردہ پوشی کی اصل حقیقت

کشمیر کے بارے میں جب مرکز اور ریاست کی حکومتیں گردن اکڑ کر کہتی ہیں کہ کشمیر کو ہندوستانی جمہوریت میں خاص مقام اور سپیشل پوزیشن عطا کی گئی ہے۔ تو سننے والا چند لمحوں کے لئے اس استدلال سے متاثر ہو جاتا ہے لیکن یہ بات صرف کشمیری عوام کو معلوم ہے کہ اس اسپیشل پوزیشن کے معنی کیا ہیں اور عملی .... طور پر یہ خاص سلوک کشمیر کے عوام کے لئے کس قدر فائدہ مند ثابت ہو چکا ہے۔ جب کشمیریوں نے ۴۷ء کے الحاق کے بعد ہندوستانی وِفاق میں خاص رویے کا مطالبہ کیا تھا اور اسے بڑی حد تک منوا بھی لیا تھا تو اُس وقت اس کا مفہوم صاف تھا...... کشمیر میں تحریک آزادی ہندوستان بھر کی تحریک آزادی سے زیادہ روشن خیال ثابت ہوئی تھی۔ اور

یہاں کی لیڈر شپ انقلابی فیصلوں پر عملدر آمد میں کسی ردِ عمل کی مزاحمت سے دامن بچانا چاہتی تھی۔ بعد میں کیا ہوا؟ وہ تاریخ ہے ہندوستان کے رجعت پسندوں نے اپنے مقامی کاسہ لیسوں کی مدد سے ہمارے کاروان انقلاب پر چھاپہ مارا اور اس شب خون میں ہماری خصوصی پوزیشن کا قتل بھی کر دیا گیا۔ اُس کے بعد دُنیا کو دکھانے کے لئے اسپیشل پوزیشن کا سوانگ تو رچایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب اس اسپیشل پوزیشن کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ کشمیر میں جمہوریت اور روشن خیالی کی ہر کرن کو چُن چُن کر بجھا دیا جائے۔ واقعات خود اس نام نہاد درجے کی اصل حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں۔ ملک کے باقی حصوں میں آزادنہ انتخاب ہوتے ہیں۔ لیکن کشمیر میں الیکشن کے نام پر جو فراڈ اور بے ایمانی ہوتی ہے۔ وہ ہماری اسپیشل پوزیشن کا خاص شناختی نشان ہے۔ اسی طرح ملک بھر میں سمگلروں تک کو اندرونی سلامتی قانون کے تحت گرفتار ہونے کے بعد ایک سال کے بعد عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن کشمیر میں پانچ سال تک کسی بڑے سے بڑے عوامی رہنما کو جیل میں بند رکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعبوں میں امتیازی درجے کے وہ فائدے گنوائے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے ریاستی عوام کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین ثبوت اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے خلاف کاروائی ہے۔ اگر چہ دیر سے ہی سہی لیکن جب مرکزی سرکار نے آخر کار کاروائی کا فیصلہ کرلیا۔ تو سارے ملک

میں پولیس اور سی آئی ڈی حرکت میں آ گئی۔ اور اس وقت کالے دھن کا بیوپار کرنے والوں، اسمگلروں اور دوسرے چور بازاروں پر کاری ضربیں لگائی جا رہی ہیں۔ اس کے نتائج اکثر صورتوں میں بڑے خوشگوار نکلے ہیں اور بعض صورتوں میں تو قیمتوں میں تیس سے چالیس فی صد تک کمی آ گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا تاثر نفسیاتی سطح پر حاصل کیا گیا ہے۔ پہلی بار ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے والوں کو سماج کے سامنے بے نقاب کر دیا گیا ہے اور اُن کے نفرت انگیز پہلوؤں کو اُبھارا گیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ سماج میں اُن کے خلاف حقارت کا ایک جذبہ تقویت پانے لگا ہے اور عام آدمی میں یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ ہر ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنا عزت حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ دولت سے عزت و آرام حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دولت جائز ذرائع سے کمائی جائے۔ ایک اور احساس یہ پیدا ہوا ہے کہ صرف روپے کی جھنکار سے لاء اینڈ آرڈر کی مشنری کو بہرا نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر حرام کی کمائی ٹیکریوں میں تبدیل ہو کے رہ جاتی ہے ہمیں علم نہیں ہے کہ حکومت ہند کا یہ اقدام محض ڈھکوسلہ ہے۔ یا صرف چند دنوں کے لئے عوام کی توجہ اُس روشن آواز سے توجہ ہٹانے کا ایک ذریعہ۔ جو پٹنہ میں جے پرکاش نارائن بلند کر رہے ہیں۔ لیکن اگر اس اقدام کو اس کے منطقی انجام تک پہنچنے دیا گیا تو یہ ناجائز کمائی کے خلاف ایک مضبوط عوامی محاذ کو جنم دے گا۔ افسوس یہ ہے کہ کشمیر میں اس

یہاں کی لیڈر شپ انقلابی فیصلوں پر علمدرآمد میں کسی ردِ عمل کی مزاحمت سے دامن بچانا چاہتی تھی۔ بعد میں کیا ہوا؟ وہ تاریخ ہے ہندوستان کے رجعت پسندوں نے اپنے مقامی کاسہ لیسوں کی مدد سے ہمارے کاروان انقلاب پر چھاپہ مارا اور اس شب خون میں ہماری خصوصی پوزیشن کا قتل بھی کردیا گیا۔ اُس کے بعد دُنیا کو دکھانے کے لئے اسپیشل پوزیشن کا سوانگ تو رچایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب اس اسپیشل پوزیشن کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ کشمیر میں جمہوریت اور روشن خیالی کی ہر کرن کو چُن چُن کر بجھا دیا جائے۔ واقعات خود اس نام نہاد درجے کی اصل حقیقت کو واضح کردیتے ہیں۔ ملک کے باقی حصوں میں آزادنہ انتخاب ہوتے ہیں۔ لیکن کشمیر میں الیکشن کے نام پر جو فراڈ اور بے ایمانی ہوتی ہے۔ وہ ہماری اسپیشل پوزیشن کا خاص شناختی نشان ہے۔ اسی طرح ملک بھر میں سمگلروں تک کو اندرونی سلامتی قانون کے تحت گرفتار ہونے کے بعد ایک سال کے بعد عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن کشمیر میں پانچ سال تک کسی بڑے سے بڑے عوامی رہنما کو جیل میں بند رکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعبوں میں امتیازی درجے کے وہ فائدے گنوائے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے ریاستی عوام کو دوسرے درجے کا شہری بنادیا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین ثبوت اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے خلاف کاروائی ہے۔ اگرچہ دیر سے ہی سہی لیکن جب مرکزی سرکار نے آخر کار کاروائی کا فیصلہ کرلیا۔ تو سارے ملک

میں پولیس اور سی آئی ڈی حرکت میں آ گئی۔ اور اس وقت کالے دھن کا بیوپار کرنے والوں، اسمگلروں اور دوسرے چور بازاروں پر کاری ضربیں لگائی جا رہی ہیں۔ اس کے نتائج اکثر صورتوں میں بڑے خوشگوار نکلے ہیں اور بعض صورتوں میں تو قیمتوں میں تیس سے چالیس فی صد تک کمی آ گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی بڑا تاثر نفسیاتی سطح پر حاصل کیا گیا ہے۔ پہلی بار ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے والوں کو سماج کے سامنے بے نقاب کر دیا گیا ہے اور اُن کے نفرت انگیز پہلوؤں کو اُبھارا گیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ سماج میں اُن کے خلاف حقارت کا ایک جذبہ تقویت پانے لگا ہے اور عام آدمی میں یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ ہر ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنا عزت حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ بلکہ دولت سے عزت و آرام حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دولت جائز ذرائع سے کمائی جائے۔ ایک اور احساس یہ پیدا ہوا ہے کہ صرف روپے کی جھنکار سے لاء اینڈ آرڈر کی مشنری کو بہرا نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر حرام کی کمائی ٹیکریوں میں تبدیل ہو کے رہ جاتی ہے ہمیں علم نہیں ہے کہ حکومت ہند کا یہ اقدام محض ڈھکوسلہ ہے۔ یا صرف چند دنوں کے لئے عوام کی توجہ اُس روشن آواز سے توجہ ہٹانے کا ایک ذریعہ۔ جو پٹنہ میں جے پرکاش نارائن بلند کر رہے ہیں۔ لیکن اگر اس اقدام کو اس کے منطقی انجام تک پہنچنے دیا گیا تو یہ ناجائز کمائی کے خلاف ایک مضبوط عوامی محاذ کو جنم دے گا۔ افسوس یہ ہے کہ کشمیر میں اس

اقدام کو اس کے رسمی آغاز تک بھی نہیں آنے دیا گیا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ہمارے حکمران کشمیر کی ترقی کے جو افسانے مزے لے لے کر اور ڈھول بتاشے بجا بجا کر سناتے ہیں۔ اُس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ کشمیر میں ناجائز دولت کا اعشاریہ ملک کے باقی حصوں کے مقابلے میں جائز دولت کے مقابلے میں زیادہ ہے یہ کوئی حادثہ نہیں۔ بلکہ ۵۳ء کے بعد مرکز اور ریاستی حکومتوں نے ایک جانی بوجھی پالیسی کے تحت ناجائز دولت پر پلنے والا طبقہ بڑی کوششوں سے پیدا کیا...... یہ طبقہ پیدا کرنے کا مقصد کشمیریوں کے آزادی پسندی عوام کے کردار کو ختم کرنے کیلئے سب سے مہلک اور کارگر ہتھیار ثابت ہونا تھا۔ یہ خون آشام منصوبہ اپنے آخری مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوا۔ اُس پر ہر ایک شخص قیاس آرائی کر سکتا ہے۔ لیکن واقع یہ ہے کہ یہ طبقہ ضرور وجود میں آ گیا اور اس نے اپنی بے محنت دولت سے کشمیر کی اقتصادیات میں ایسی اُتھل پتھل مچادی کہ ہمارا نازک اقتصادی میزان درہم برہم ہو کے رہ گیا۔ بلکہ ہمارے معاشرے کی چولیں تک ہل گئیں۔ کشمیر میں اس وقت مجلسی زندگی میں بے راہ روی، لوٹ کھسوٹ، اخلاقی قدروں کی پامالی، مہنگائی اور امیری غریبی کے بڑھتے ہوئے تفاوت کی جو علتیں نظر آ رہی ہیں۔ اُن کا سرچشمہ اسی طبقے کی ناجائز دولت ہے۔ یہ طبقہ حکومت میں بھی اپنی جڑیں پھیلا چکا ہے اور عوامی زندگی کی شاہ رگوں پر بھی اس کے ناسور کی چھوت نظر آتی ہے۔ ہمارے وزیروں سے لے

کر ہمارے ٹھیکیداروں تک یہ طبقہ شراکت اور شمولیت کی ایک ہی لڑی میں منسلک ہے۔ شہروں میں بڑی بڑی کوٹھیوں ، بسوں، ٹیکسیوں ، کاروں ، کارخانوں پر انہی کا قبضہ ہے اور گاؤں میں میلوں تک پھیلے ہوئے باغات ان کی تجوریوں کے لئے سپلائی لائن کا کام دیتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ریاست سے کالے سونے یعنی چرس کی سمگلنگ نے سونے چاندی کے جوگل بوٹے کھلائے ہیں۔ اُس کا اندازہ کرنے کے لئے علم جیوتش اور نجوم کا ماہر ہونے کی ضرورت نہیں۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس حرام کی کمائی کا نہ کوئی حساب مقرر ہے اور نہ اس پر انکم ٹیکس ادا کرنے کی کوئی پابندی عائد ہے۔اس کے بدلے کشمیر میں چھوٹے تاجروں ، دکانداروں ، ملازموں وغیرہ کو ہراساں کیا جاتا رہا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب ملک بھر میں ناجائز دولت کے ناسور کے خلاف مہم شروع کی جا چکی ہے تو ریاستی حکومت بھی حالات کا اشارہ سمجھ کر حرکت میں آجاتی ۔لیکن اس کے برعکس یہاں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی ۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ان سمگلروں اور ذخیرہ اندوزوں کو ہر ممکن سہولت اور فرصت دی گئی تا کہ وہ اپنے ذخائر کو دبانے اور اپنی حفاظت کے انتظام مکمل کرسکیں۔اور اگر اخباری اطلاعات صحیح ہیں تو بڑے بڑے مگرمچھوں کو ریاست سے فرار ہو کر ملک کے مختلف حصوں میں پناہ لینے کا اشارہ بھی دیا گیا اور اس طرح سے اُس Surprise کا سارا زور ختم کر دیا گیا۔جس کے تحت باقی ملک میں سمگلروں وغیرہ کو Misa کے

تحت راتوں رات نافذ کرنے کے فوراً بعد گرفتار کرلیا گیا۔ اس وقت جبکہ سارے ملک میں ناجائز دولت کے خلاف مہم نے ایک ہیجانی صورت حال پیدا کردی ہے۔ کشمیر میں اس قبیلے کے لوگ بڑے آرام سے دندنا رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کشمیر اُس ہندوستان کا حصہ ہے ہی نہیں۔ جہاں حرام کی دولت کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے کچھ عناصر اب بھی کشمیر میں ناجائز دولت رکھنے والوں کو اپنا اصل وفادار سمجھتے ہیں اور کچھ یہ کہ خود ریاست کے اقتدار کے مالک ان لوگوں کے ساتھ تک اشتراک اور تعاون میں بندھے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب ملک کے باقی حصوں میں عوام اس جہاد کے فائدوں سے مالا مال ہونے لگے ہیں۔ کشمیر سپیشل پوزیشن کی چھاؤں میں اُونگھ رہا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵ء

چراغ بیگ کے قلم سے

مشتاق احمد کا ''گناہ:-

بسنت باغ کا مشتاق احمد محکمہ بجلی میں میٹر ریڈر ہے۔ اس کی شادی چراغ بیگ کے پڑوس میں رہنے والی ایک بھولی بھالی لڑکی سے ہوئی ہے اور چھ سات سال قبل جب وہ دُلہا بن کر ہمارے محلے میں آیا تھا۔ تو میں نے اور محلے کے دوسرے لوگوں نے اُس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال کر، اس کا شاہانہ استقبال کیا تھا، یہ بہت پُرانی بات ہے۔ اور بظاہر اس کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن پچھلے ہفتے ایک بالکل نئی بات ہوگئی جس نے مجھے یہ بات یاد دلائی۔ میٹر ریڈر مشتاق احمد گرفتار کرلیا گیا اور اس کی بیوی نے بڑی بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں مجھے فون پر یہ اطلاع دی کہ اس کا شوہر گرفتار کرلیا گیا ہے۔ میں نے گرفتاری کی وجہ پوچھی، تو اِس نے رندھے ہوئے گلے سے صرف یہ کہا۔ ''کہ غلطی ہماری تھی، ہم نے گیسٹ کنٹرول

آرڈر کی خلاف ورزی کی تھی۔"

مشتاق احمد میٹر ریڈر کی بیوی کا یہ کہنا تھا کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ "کیوں کی تھی قانون کی خلاف ورزی؟ کیا حق تھا تمہیں اِتنے لوگوں کو مدعو کرنے کا؟ تم لوگ قانون کا مذاق اُڑاتے ہو؟ تم سمجھتے کیوں نہیں کہ دنیا بدل گئی ہے اور اب وہ پُرانی دھاندلیاں نہیں چلیں گی، میں تم لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ قانون شکنی ہر حال میں قانون شکنی ہے۔ تمہیں اس کی سزا بھگتنا ہی ہوگی" یہ کہتے ہوئے میں نے بڑے زور سے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے رونے کی آواز صاف طور سنائی دے رہی تھی، لیکن قانون بہر حال قانون ہے۔ وہ مُجرم کے آنسو بہانے سے بدل نہیں سکتا۔

پھر اس واقعے کے دو دن بعد میں شہر کے ایک بہت بڑے افسر کے ہاں، شادی کی ایک تقریب پر مدعو تھا، افسر صاحب نے اپنی حیثیت اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے صرف دعوتِ عصرانہ کا انتظام کیا تھا۔ لیکن چائے کی یہ دعوت بھی اتنی پُر تکلف اور پُر تنوع ثابت ہوئی کہ اس کے مقابلے میں، مشتاق احمد میٹر ریڈر کا وازہ وان بھی شرماتا تھا۔ معزز مہمانوں کے لئے سجی ہوئی چائے کی ہر میز گیسٹ کنٹرول آرڈر کا مُنہ چڑا رہی تھی اور مہمانوں میں شہر کے سرکردہ امیر، بہت سے موجودہ اور سابق وزیر، انتظامیہ کے اعلیٰ ترین افسر، اور گیسٹ کنٹرول آرڈر کی خلاف ورزی پر مشتاق احمد، میٹر ریڈر، جیسے قانون شکن افراد کو گرفتار کرنے والے کئی اعلیٰ و ادنیٰ پولیس کے حاکم سبھی موجود تھے۔ اگر میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دیتا، تو میں نے

اس دعوت عصرانہ میں ریاستی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور لاسیکرٹری کو بھی دیکھا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا۔ کہ افسر صاحب کے گھر کس کی شادی تھی، لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مہمانوں کی تعداد اور اشیائے خوردنی کی مقدار پر سرکاری پابندی کی صریح خلاف ورزی کے باوجود، یہ دعوتِ عصرانہ بخیر وعافیت گذر گئی۔

کل شام میرے ایک عزیز دوست کے گھر بھی شادی کی تقریب تھی۔ اس موقعہ پر بھی شہر کے بڑے بڑے سیاستی لیڈر، تاجر، کچھ سر کردہ وزیر اور وزراء مملکت رونقِ محفل بنے بیٹھے تھے۔ ایسی تقریبات پر سرکاری حکم کی رُو سے مہمانوں کی کل تعداد پچیس سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن میرے مہمان خانے میں داخل ہوتے وقت مہمانوں کی تعداد پچاس کی حد سے بڑھ چکی تھی۔ اور ابھی کچھ اور لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ دستر خوان بچھنے تک معزز مہمانوں کی تعداد ایک سو کی تعداد سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور اب اس میں قانون سازوں کے علاوہ، قانون کے بڑے بڑے محافظ بھی شامل تھے، پُر تکلف دعوت کا یہ تکلیف دہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ اور معزز میزبان نے دل کھول کر اپنی دولت اور ثروت، فیاضی اور خوش مذاقی کا مظاہرہ کیا۔ قانون ساز اور قانون کے محافظ دونوں ہی چونکہ معزز مہمان بن کر اس گناہ میں شریک تھے، اس لئے اِسے ایک ایسے ''ثواب'' کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی کہ جس میں شرکت سے بہت سے گناہوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور میرے کانوں میں مشتاق احمد میٹر ریڈر کی بیوی کی آواز

گونج رہی تھی۔

جب سے اس شہر میں گیسٹ کنٹرول آرڈر نافذ ہوا ہے، ہمارے معاشرے کے بہت تضادات ہمارے لیڈروں کی بہت سی کمزوریاں، ہمارے حاکموں کی بہت سی کوتاہیاں اور ہمارے قانون کی بہت سی خامیاں منظر عام پر آنے لگی ہیں، جب بھی کسی رئیس شہر کے ہاں کسی دعوت یا تقریب کا اہتمام ہوتا ہے تو گیسٹ کنٹرول آرڈر کے معانی اور اس کا مطلب بدل جاتا ہے۔ لیکن جب اس قسم کی دعوت یا تقریب کا اہتمام کرنے والا، مشتاق احمد میٹر ریڈر جیسا کوئی غریب آدمی ہو تو قانون سازوں کے تیور، قانون دانوں کا لہجہ اور قانون کے محافظوں کا روّیہ ہی بدل جاتا ہے۔ رئیسوں کے ہاں چونکہ شہر کے بڑے بڑے لیڈر اور حاکم بھی مدعو ہوتے ہیں۔ اس لئے مہمانوں کی تعداد اور کھانوں کی مقدار پر پابندی کا حکم حرف غلط کی طرح مِٹ جاتا ہے۔ اور قانون کے محافظ، بجائے خود قانون شکنی کے بہت بڑے محافظ بن جاتے ہیں، اس کے برعکس جب مشتاق احمد میٹر ریڈر اپنی بہن کی شادی پر پچاس کی بجائے ساٹھ آدمیوں کو مدعو کرتا ہے۔ تو قانون کا محافظ دستہ عین اُس وقت حملہ آور ہو جاتا ہے، کہ جب دُلہا برات لے کر دروازے پر دستک دیتا ہے، مشتاق احمد میٹر ریڈر کا قصور یہ نہیں ہے کہ اس نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کا سب سے بڑا قصور یہ ہے کہ کوئی امیر آدمی، کوئی لیڈر، کوئی حاکم، اس کا رشتہ دار نہیں ہے۔ اِس کی سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کسی وزیر یا نائب وزیر کو مدعو نہیں کر سکتا۔ اس کا جرم یہ ہے کہ پولیس

کے کسی بڑے افسر سے اس کی دوستی نہیں ہے۔ اس کا گناہ یہ ہے کہ وہ پی، ڈبلیوڈی کا کوئی انجینئر نہیں، محکمہ بجلی کا ایک ادنیٰ ملازم ہے، الغرض اس کی غربت، اس کا سب سے بڑا قصور ہے اور اسی لئے اُسے اپنی بہن کی شادی کے دِن بڑے گھر کی ہوا کھلائی جاتی ہے۔

چراغ بیگ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۱۴ کا حوالہ نہیں دینا چاہتا کہ یہ بنیادی حق، جس کی رُو سے ہر شخص قانون کی نگاہوں میں برابر کا درجہ رکھتا ہے، ان دنوں معطل ہے۔ لیکن اخلاق، انسانیت اور شرافت کے قوانین دنیا کی کسی ایمرجنسی کے تحت معطل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے وہ اخلاق اور انسانیت اور شرافت کے نام پر اس ریاست کے حاکموں سے یہ پوچھنا چاہتا ہے، کہ مشتاق احمد میٹر ریڈر کا گناہ کیا ہے؟ اگر اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے ایک مروّجہ قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے ہاں شادی کی تقریب پر مقررہ تعداد سے زیادہ لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ تو چراغ بیگ یہ پوچھنا چاہتا ہے، کہ کیا اس قسم کی خلاف ورزی کرنے والے ہر شخص کو گرفتار کرنا ضروری نہیں؟ ٹھیک اسی دن، جس دن مشتاق احمد میٹر ریڈر کو گیسٹ کنڑول آرڈر کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اِس دن شہر کے مختلف حصوں میں بہت سے رئیسوں کے ہاں شادی بیاہ کی تقریبات منائی جا رہی تھیں اور ہر تقریب میں گیسٹ کنڑول آرڈر کی صریح خلاف ورزی کی گئی تھی۔ کیا ان کے خلاف اس لئے کوئی کاروائی نہیں ہوتی کہ ان دعوتوں میں شہر کے بارسوخ حاکم، تاجر اور صاحب ثروت لوگ شریک تھے؟ کیا قانون کے استعمال میں یہ امتیاز،

انسانیت اور اخلاق کے نام پر جائز قرار دیا تھا سکتا ہے؟ کیا مشتاق احمد میٹر ریڈر کو صرف اس لئے سزا دی جائے گی کہ وہ غریب ہے، بے اثر ہے، بے رسوخ اور بے زبان ہے؟ چراغ بیگ مشتاق احمد میٹر ریڈر کی گرفتاری پر احتجاج کرتا ہے۔ وہ اس ملک کے قانون سازوں اور قانون دانوں سے اپیل کرتا ہے کہ جس قانون کا وہ خود احترام نہیں کر سکتے۔ اُس قانون کو قانون کی کتاب سے اُٹھا کر پھینک دینا چاہئے جس قانون کی وہ کھلے بندوں خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہوں، اس قانون کو پاس کرنا ہی کیا ضروری ہے؟ جس قانون کی بے حُرمتی پر خود انہیں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔ اس قانون کے نام پر کسی بھی مشتاق احمد میٹر ریڈر کو گرفتار نہیں کیا جانا چاہئے۔ اور گیسٹ کنٹرول آرڈر ایک ایسا ہی قانون ہے کہ جس کے لئے نہ کسی حاکم کے دل میں احترام ہے اور نہ غالباً اس پر عمل پیرا ہونے کی ہمت! اس لئے اسے صرف مشتاق احمد جیسے میٹر ریڈروں پر نافذ کرنے کا کوئی اخلاقی یا قانونی جواز موجود نہیں۔ اس بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ امیروں اور غریبوں کے لئے ایک ہی قانون کی متضاد استعمال سے یہی بہتر ہے کہ اس قانون کو کالعدم قرار دیا جائے، ایسا کرنے سے ہمارے حاکموں کی عزت اور شہرت پر بھی حرف نہیں آئے گا اور پولیس کے اہلکاروں کو غریبوں کی عزت سے کھیلنے کا موقع بھی نہیں آئے گا۔

اساتذہ کا جرم:۔

جماعت اسلامی کے مولوی صاحبان سے چراغ بیگ کی لڑائی بہت

پُرانی ہے ۔ اس وقت بھی کہ جب ہمارے بہت سے برگزیدہ رہنما اور سرکردہ سیاستدان جماعت اسلامی کو ایک بے ضرر، معصوم اور مخلص جماعت تصور کرتے تھے، اس ناچیز نے اس جماعت کے لیڈروں کی فرقہ وارانہ ذہنیت، فتنہ پرورانہ سرگرمیوں اور مریضانہ نفسیات کو بے نقاب کرتے ہوئے ان کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ لیکن اب جبکہ یہ جماعت خلاف قانون قرار دی گئی ہے اس کے اکثر زعما نظر بند ہیں کسی شخص کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ان کے بے بسی اور زبان بندی سے فائدہ اُٹھا کر انہیں صلواتیں سنائے، اسی لئے چراغ بیگ نے پچھلے ایک ماہ سے اپنے ان دیرینہ دشمنوں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے اور نہ کہنے کا ارادہ ہے۔ لیکن اس جماعت کی نسبت سے کچھ ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ کہ جن پر اظہار خیال کرنا میری اخلاقی ذمہ داریوں میں شامل ہے اور ایسے مسائل میں سے ایک مسئلہ ان اساتذہ کا ہے کہ جو جماعت اسلامی کے قائم کردہ اسکولوں میں پڑھاتے تھے، ان تمام سکولوں کو چونکہ حکومت نے بند کر دیا ہے اور ان میں تعلیم پانے والے بچوں کو سرکاری سکولوں میں داخل کیا جا رہا ہے۔ اس لئے اساتذہ کی ایک بہت بڑی تعداد بے کار اور بے روزگار ہو گئی ہے، اور یہ غریب بجا طور پر حیران و پریشان ہیں۔ ممنوعہ جماعت اسلامی کے سکولوں میں پڑھانے والے ان اساتذہ کی اکثریت کو جماعت کے اس منفی فلسفے اور ٹیڑھی منطق سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ جس میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے علاوہ کسی چیز کی گنجائش باقی نہیں۔ یہ بے چارے روزگار کی تلاش میں پھرتے

جماعت کی ان چراگاہوں میں داخل ہو گئے تھے اور پیٹ کی بھوک ایسی ہے کہ اس کو مٹانے کی کوشش میں انسان نہ چارے کے مذہب کے بارے میں کچھ پوچھتا ہے اور نہ کھلانے والے کے مسلک کے بارے مین، غم زورگار کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان بے چاروں نے قلیل سے قلیل تنخواہوں اور ملازمت کی انتہائی غیر یقینی شرطوں پر اپنے پاؤں میں یہ زنجیریں ڈال دی تھیں اور اب جبکہ غیر معمولی حالات کی بناء پر چراگاہوں کو بند کر دیا گیا ہے، یہ غم نصیب ایک بار پھر بے یار و مددگار بن گئے ہیں، انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ان تجربہ کار اُستادوں پر صرف اس لئے کہ وہ جماعت اسلامی کے سکولوں میں ملازم تھے، سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ ان میں سے اکثر اُستاد سرکاری سکولوں میں کام کرنے والے اساتذہ کے مقابلے میں زیادہ تجربہ کار، فرض شناس اور مستعد ہیں، ان کے تجربے، ان کی لگن اور فرض شناسی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اپنے جوہر دکھانے کے بہتر مواقع فراہم کئے جائیں اور بغیر کسی احساس گناہ کے ایک نئی زندگی شروع کرنے میں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

رسم اجراء
آنکھوں دیکھا حال

تاریخ : یکم اگست

وقت : ساڑھے پانچ بجے شام

مقام : نیڈوز ہوٹل کا تاریخی حال

روزنامہ : ''آئینہ'' کا افتتاح

(یہ خبر آپنے اخباروں میں پڑھنے سے پہلے ریڈیو سے سُنی اور ٹیلی ویژن پر دیکھی ہوگی۔ خبر کی حیثیت سے یہ پرانی ہوچکی ہے اور اخباروں کے لئے اب یہ کسی مصرف کی نہیں، لیکن ہفت روزہ ''آئینہ'' کے ہزاروں پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں ...... یعنی آپ کو اپنے جریدے سے جو جذباتی وابستگی ہے، اس کی وجہ سے اس محفل کی فضا کو آپ تک پہنچانے کی ذمہ داری

گزٹ'' بھی کہا جاتا تھا۔ نہیں بیچا، اور مشکل مالی حالات میں اپنے قلم کی آزادی قایم رکھی۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اگر'' آئینہ'' واقعی شمیم گزٹ ہوتا تو وہ اس کو منافع پر بیچ سکتے تھے۔ کیونکہ وہ بلاشرکت غیرے اس کے مالک تھے، اُن کا اپنا بات کہنے کا تیکھا انداز ہے، اور انہوں نے اسی انداز میں بات کی۔ شمیم احمد شمیم نے شیخ صاحب کو بہت مشکل میں ڈال دیا۔ اور مدیر'' آئینہ'' کی حیثیت سے پہلی بار انہوں نے ایک طرح سے بلیک میل کا حربہ استعمال کیا۔ انہوں نے کہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ شیخ صاحب نے پہلے کبھی اخبار کا چندہ دیا ہے یا نہیں۔ لیکن میں اُن سے گزارش کروں گا کہ وہ روزنامہ'' آئینہ'' کا سالانہ چندہ ستر روپے دے کر خریداری کی مہم کا افتتاح کریں۔'' آئینہ'' کے پڑھنے والوں یعنی آپ کی طرح شیخ صاحب بھی یہ بات جانتے ہیں کہ مدیر'' آئینہ'' کے پڑھنے والوں یعنی آپ کی طرح شیخ صاحب بھی یہ بات جانتے ہیں کہ مدیر'' آئینہ'' نے ان کی ذات سے اپنی عقیدت کے باوجود ان کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ اور شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ آپ کی طرح'' آئینہ'' کے رسیا ہیں اور اُنہوں نے کبھی آئینہ میں اپنی تنقید پڑھ کر اپنا دل میلا نہیں ہونے دیا۔ شیخ صاحب نے ان دنوں کی یاد تازہ کی، جب ریاست میں اخبار نکالنا بہت مشکل تھا۔ انہوں نے کہا کہ ایک ایک ورق کا اخبار نکالنا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ اور میں کتابت کرا کے، کاپی اپنی جیکٹ میں رکھ کر پریس کے چکر لگاتا تھا۔ اور پریس بڑی مشکل سے اُسے چھاپنے کے لئے تیار ہوتے تھے آج تو

صرف جموں سے کوئی اسی ہفتہ وار شائع ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب نے فرمایا کہ میں نے میرے رفیقوں نے، ان شہیدوں نے، جنہوں نے آزادی اور جمہوریت کے قیام کے لئے اپنی عزیز جانوں کی قربانیاں دیں، پریس کی آزادی کو ہمیشہ مقدس سمجھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ریاست میں صحافت کا معیار بلند ہو۔ اور اسی لئے میں ''آئینہ'' کے روزنامہ ہونے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے شمیم صاحب کی سیمابی طبیعت سے ڈر لگتا ہے کہ وہ روزنامے کو باقاعدگی سے شائع کر سکیں گے یا نہیں۔ میں سالانہ چندہ پیش کر رہا ہوں، اور آپ سے بھی چاہوں گا کہ سالانہ چندہ دیں، تاکہ اگر کبھی اخبار کی اشاعت میں بے قاعدگی ہو تو شمیم صاحب کی گردن پکڑ سکیں۔ شیخ صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ میں اخباروں کے خلاف تعزیری کاروائی نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے اخباروں سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا خود احساس کریں۔ اپنی تقریر کے آخر میں شیخ صاحب نے اپنی جیب سے ستر روپے نکال کر شمیم صاحب کی طرف بڑھائے اور اس طرح چندہ سالانہ وصول کرنے کی ابتداء ہو گئی۔

شیخ صاحب سے پہلے پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی تقریر میں سرینگر کے اخبار نویسوں کو مخاطب کیا۔ انہوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ جب تک خبر کی پوری طرح تصدیق نہ کر لی جائے۔ اخبار میں نہ چھاپی جائے اور اگر کبھی کوئی خبر غلط اطلاع کی بناء پر چھپ جائے تو اخبار کا فرض ہے کہ وہ خود اس کی تردید کرے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں

ہماری روایات کچھ بہت اچھی نہیں ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں، پونا میں طاعون کی وبا پھیلی تھی۔ اس وبا پر قابو پانے کے لئے حکومت نے کچھ سخت اقدامات کیے۔ فوج کو بھی استعمال کیا گیا۔ بہت سی افواہیں پھیلیں کہ سرکار نے بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ اُس زمانے میں گوکھلے ولایت میں پڑھتے تھے۔ اُن کو کسی نے ان زیادتیوں کے بارے میں لکھا گوکھلے نے ان زیادتیوں کا ذکر ایک مراسلے میں کیا جو مانچسٹر گارڈین میں چھپا۔ کچھ دنوں بعد گوکھلے کو معلوم ہوا کہ اُن کی اطلاعات صحیح نہیں تھیں۔ انہوں نے ''مانچسٹر گارڈین'' میں دوسرا خط شائع کرایا۔ اور اس بات کے لئے معافی مانگی کہ غلط اطلاعات کی بناء پر انہوں نے سرکار کو مورد الزام قرار دیا تھا۔ بال گنگا دھر تلک کو گوکھلے کو یہ رویہ پسند نہ آیا اور انہوں نے کہا کہ گوکھلے کے معافی مانگنے سے برطانوی سرکار کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ پھر جب گوکھلے وطن واپس آئے تو انہوں نے دوبارہ ٹائمز آف انڈیا میں ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں مانچسٹر گارڈین میں اپنے پہلے خط میں ندامت کا اظہار کیا تھا۔ بزاز صاحب نے کہا کہ بدقسمتی سے تلک نے جو روایت قائم کی وہ غیر صحت مند ہے۔ ہمیں گوکھلے کی روایت اپنانا چاہیے تھی۔ صحافتی دیانت کے سلسلے میں بزاز صاحب نے اور بھی بہت سے مشورے دیئے۔ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اور واضح الفاظ میں یہ بات کہی کہ وہ مدیر ''آئینہ'' کی ہر رائے سے متفق نہیں رہے ہیں۔ اس کے باوجود وہ الف سے ی تک ''آئینہ'' پڑھتے ہیں اور جب کبھی اس کی اشاعت میں بے قاعدگی ہوئی۔ ان کو بڑی مایوسی

ہوئی۔ کیوں کہ وہ ہر ہفتے بے چینی سے آئینہ کا انتظار کرتے تھے۔ بزاز صاحب نے ایک مشورہ اور دیا۔ اور وہ یہ کہ اخبار کے ایڈیٹر کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ جن سے اختلاف رائے رکھتا ہو، ان کے نقطہ نظر کو بھی جگہ دے۔ اپنے مخصوص انداز میں بزاز صاحب کی تقریر کے فوراً بعد شمیم صاحب نے ان کے مشوروں کے لئے بزاز صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہاوت بھی دہرائی کہ واعظ جو کہے وہ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ جو وہ کرے اُسی کا اتباع کرنا چاہیے اس لئے میں وہی کروں گا جو خود بزاز صاحب اس زمانے میں کیا کرتے تھے جب وہ اخبار ایڈٹ کرتے تھے۔ البتہ میں نے بزاز صاحب کے مشورے ذہن میں محفوظ کر دیے ہیں۔ جب میرا بیٹا بڑا ہو جائے گا اور اخبار کی ادارت سنبھالے گا تو یہ باتیں میں اسے بتا دوں گا۔

یہ باوقار تقریریں ایک گھنٹے تک ہوتی رہیں۔ اس کے بعد حاضرین کے اعزاز میں عصرانہ ہوا۔ اس میں مدیر ''آئینہ'' سیخ کباب کی روایت نہیں توڑ سکے۔

عیداور سیاست

عید الضحیٰ کا فلسفہ قربانی، ایثار اور خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کے اس جذبے کی تجدید سے تعلق رکھتا ہے کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر کے کیا تھا...... اس دور میں جبکہ ہمارے حکمران اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی خاطر اپنی قوم کے مفادات اور اپنا ایمان تک قربان کر دیتے ہیں...... عید الضحیٰ کی اہمیت اور معنویت کچھ اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مقدس اور متبرک تقریب پر بھی ہمارے حکمران اپنی روح کو غسل دینے کی بجائے اداکاری، ریاکاری اور سیاست گری کا بازار گرم کر کے غریب عوام کو مسلسل فریب دینے کے اپنے شغل سے باز نہیں آتے...... عید گاہوں میں عید کے موقع پر سیاسی تقریریں اور مظاہرے کرنے کی روایت بھی بابائے قوم جناب شیخ محمد عبداللہ نے شروع کی ہے۔ اور اب ان کی دیکھا دیکھی نیشنل کانفرنسی حکومت کا ہر وزیر اور نمبر دار عید گاہوں میں قوم سے خطاب کرنا اپنا پیدائشی حق اور فرض منصبی سمجھنے لگا ہے۔